ڈاکٹر آر۔ پی۔ بہادر

ایم ۔ اے، ڈی ۔ فل

الہ آباد یونیورسٹی

الہ آباد

اِس کتاب کو معنون کرتا ہوں اپنے دوست
ڈاکٹر شبیہ احمد کے نام

جو کسی وقت میرے دوست اور ناشر دونوں
تھے لیکن چونکہ اُنھوں نے آج ناشر نہ ہوتے
ہوئے بھی مجھے بطور ایک دوست کے نہیں
چھوڑا اِس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ آنسو اور
پسینہ، اُنھیں کے حُسنِ ذوق اور مذاق کو
بھینٹ چڑھاؤں!

فہرست مضامین

کتاب کے بارے میں

'آنسو اور پسینہ' پہلے کہانیوں کے مجموعہ کی شکل میں چھاپنے کا ارادہ تھا۔ لیکن پیر کے نیچے سے اگر زمین ہی کھسک جائے تو کوئی کیا کرے یعنی پہلے یہ خیال تھا کہ بقیہ زندگی افسانے ہی لکھتا رہوں گا لیکن اس درمیان میں قسمت نے وہ وہ پلٹے کھائے اور کاروان زندگی نے وہ وہ منزلیں طے کیے کہ افسانے کہاں سے لکھتا خود ہی افسانہ کا مضمون ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اب افسانے لکھنے سے جیسے ایک قسم کی چڑھ پیدا ہو چلی ہے۔ دماغ کی وہ کیفیت ہو گئی ہے کہ وہ اب دنیا اور زندگی کو محض ایک ...، ہی سمجھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ دل کسی صورت سے بات بنا کر کہنے کو راضی نہیں ہوتا۔ اس لئے آرٹ، اور اس کے پہلوؤں پر آنکھ اٹھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اندر سے بار بار کوئی یہی کہتا ہے کہ جو کچھ کہنا ہے اور اگر کہنا ضروری سمجھتے ہو تو صاف صاف کہو۔ 'ہیرو'، اور 'ہیروئن' بنا کر جو انھیں مصیبتوں میں ڈالتے ہو اور اس طرح کہانی کا 'پلاٹ' تیار کرتے ہو اور پھر زندگی، زمانہ اور آدمی کے بارے میں نہایت ہی 'رقیق' اور کبھی کبھی الجھے ہوئے نتیجوں پر پہونچتے ہو یہ بناوٹی طریقہ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اس طرح خود کو دھوکا دیتے ہو اور دوسروں کو بھی۔ چنانچہ

افسانے لکھنا چھوڑ کر، یعنی گڈے گڑیا کی شادی کرانا اور اُن کے بچوں کو کفن پہنانا چھوڑ کر، سیدھی سیدھی بات جو کہنا ہے کہو۔ جس کو سننا ہوگا سُنے گا یا اپنا راستہ لے گا۔ تم خواہ مخواہ کڑوی دوا پر میٹھی چاشنی کیوں دیتے ہو۔ آخر ہر بات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ اگر دس بیس ہزار سال تک زندگی اور دنیا سے تجربے کر کے بھی آدمی نے اپنا بچپنا نہ چھوڑا تو تمھیں کیا پڑی ہے جو تم آج بھی اُسے بچّہ سمجھ کر کڑوی دوا کو میٹھی بنا کر اُس کے گلے کے نیچے اُتارنا چاہتے ہو۔

کہانیاں نہ لکھنے کی اپنی مجبوری اور دقّت کو جس طرح میں نے یہاں پیش کیا ہے اُس کا پڑھنے والوں پر ایسا اثر پڑ سکتا ہے کہ گویا قصداً سوچ سمجھ کر اِس ذہنی یا عقلی نتیجے پر میں پہونچا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ صورت اصلیت سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ افسانے لکھنے کے خلاف اِس قسم کی کوئی رائے قائم کر کے میں نے کہانیاں لکھنا نہیں چھوڑا۔ بلکہ مستقل ۶ سال تک کوشش کر کے بھی جب کہانیاں نہ لکھ سکا تو اِس نتیجہ پر پہونچا کہ شاید کہانیاں لکھنے کے لیے میرے اندر پہلی ہی ذہنی اور نفسی کیفیت ہی اب نہ رہی۔

اِس کے برخلاف، آل انڈیا ریڈیو کی بدولت مزاحیہ یا سنجیدہ مضامین لکھنے کے لئے جب بھی قلم اُٹھایا تو اِس نئے کام میں خاص طور سے جی لگا۔ میں خود نہیں بتا سکتا کہ مجھے زیادہ کامیابی کہانی یا مضمون لکھنے میں نصیب ہوئی ہے۔ میں تو صرف یہی جانتا ہوں کہ

جہاں مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے وہاں کہانی لکھنے سے جیسے جی گھبراتا ہے۔ یہ تو دوسرے ہی بتائیں گے (اگر اُن کو اِس کی فرصت ہے!) کہ آئندہ مجھے مضامین یا کہانیاں لکھنا چاہئے یا اب دونوں کی جان چھوڑنا یا دونوں سے اپنی جان چھوڑانا چاہئے۔

لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی کتاب لکھنا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر اور طریقوں سے کھانے بھر کو کما لینا تو کم سے کم میں تو اپنے کو اِس مصیبت میں نہ ڈالتا کہ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کرنے قلم ایڑی رگڑوں اور پھر اپنی تقدیر سال دو سال کے لئے کسی کاروباری ناشر کو سونپ کر بیس روپیہ دس آنہ مہینہ رائلٹی، کماؤں۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" پر اب تک بہت بحث ہو چکی ہے۔ لیکن جب اِس قسم کی بحثیں ہوتی دیکھتا ہوں تو مجھے اِس بات سے کڑھن ہوتی ہے کہ میری طرف جیسے کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا ہے، کیونکہ دراصل میری جگہ تو "ادب برائے پیسہ" والوں کی فہرست میں آتی ہے۔

یہ محض مذاق نہیں ہے بلکہ میں اِس وقت اپنی سمجھ میں ایک نہایت ہی سنجیدہ بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اوروں کے بارے میں نہیں کہہ سکتا اِس لئے کہ یہ بات بدتمیزی میں شامل ہوگی۔ لیکن اپنے بارے میں کہنے کا اختیار ضرور رکھتا ہوں کہ میں خود اِس وجہ سے نہیں لکھتا کہ مجھے کچھ ایسا احساس ہے کہ میں کوئی بڑی

بات کہہ رہا ہوں یا انسانیت کو نیا پیغام دے رہا ہوں۔ جہاں تک انسانیت کو پیغام دینے کا سوال ہے وہ ایک زمانہ ہوا کرشن بھگوان، گوتم بدھ، مہاتما عیسیٰؑ، محمدؐ صاحب اور دوسرے ہم کو دے گئے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اُس پیغام کو انسانوں نے آج بھی اپنایا نہیں۔ سچ بولنا، ایمانداری برتنا، دوسروں کو نقصان نہ پہنچانا، مجبوروں کی مدد کرنا اب تک آدمی نے نہیں سیکھا۔ اِس لئے بجائے کسی نئے پیغام دینے کے ابھی ہمیں، بغیر ہمت ہارے، ہزار دو ہزار سال تک اِسی پیغام کو آدمی کے کانوں کو سناتے رہنا ہے۔ اِس کے علاوہ، اگر دنیا اور اُس کی تاریخ کے بارے میں جاننا ہے تو وہ ساری باتیں بھی مذہبی کتابوں، اِن سائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia) اور دوسری تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جہاں تک اونچے پایہ کے ادب کا سوال ہے اُس کی مثال جو کالیداس اور شیکسپیر سے لے کر فرانسیسی، جرمن اور رُوسی ادب اور برنرڈ شا کی کتابوں میں موجود ہے اُس کو ہم آج بھی چھُو نہیں سکتے۔ اِس لئے اگر یہی چیزیں ترجمہ کر کے لوگوں کو پھر سے پڑھائی جائیں تو پڑھنے والوں کو میری اور میرے جیسے دوسرے لکھنے والوں کی کتابیں پڑھنے سے زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ اور اگر اِس کے علاوہ بھی پڑھنے کی چیزوں کی ضرورت ہے تو اُس کے لکھنے والے بھی تقریباً ہر مُلک کے ادبی چوٹی پر موجود ہیں۔ اِس لئے ہماری ضرورت تو کسی طرف سے پیدا نہیں

ہوتی - پھر بھی ہم لکھتے ہیں۔

چنانچہ سوال تو دراصل یہ ہے کہ آخر ہم چھوٹ بھیئے لکھتے کیوں ہیں - اِس کا جواب میری سمجھ میں یہ ہے کہ ہم پیسہ کے واسطے لکھتے ہیں۔ یعنی اِس وجہ سے نہیں لکھتے کہ ہم کوئی فطین (genius) ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے فطین بہت کم ہیں - ویسے تو فطینوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ عام طور سے پیدا نہیں ہوتے۔ برنرڈ شا کا بیان ہے کہ پیدائشی یا فطری قابلیت پانچ ہی فی صدی ہوتی ہے، پنچانوے ۹۵ فی صدی قابلیت تو صرف قلم ہی رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پنچانوے ۹۵ فی صدی قلم رگڑ کر بھی زندگی کے اخیر میں فطین (genius) ہونے کے حوصلے کو پورا نہیں کر سکتے۔

آپ کہیں گے کہ اگر سارے لکھنے والوں کا یہی نظریہ ہو جائے تب تو فطین پیدا ہی نہ ہو سکیں گے کیونکہ پھر ہر آدمی اپنے کو احمق سمجھ کر، ہمت ہار کر بیٹھ جانا چاہے گا۔ اِس دلیل کی قیمت میں ماننے کو تیار ہوں - لیکن میرا اعتراض یہ ہے کہ اگر سب ہی لکھتے اور کتابیں چھاپنے لگیں، بالکل ویسے ہی جیسا اس وقت اِس ملک میں ہو رہا ہے، تو فطینوں کا گلا تو زمانہ اس طرح گھونٹ کر رکھ دے گا۔

اِس وقت صورت یہ ہے کہ جو بھی چار سطر لکھ سکتا ہے وہ

آناً فاناً لیکھک یا مصنّف بن جاتا ہے۔ پھر وہ اخباروں اور رسالوں کے پنّے بھرنے لگتا ہے۔ اور جب کچھ پنّے اس طرح بھر لیتا ہے تو اُس مواد کو کتاب کی شکل میں چھپا دیتا ہے (جو میں کرتا ہوں)۔ پھر بازار میں کتابوں کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ کتابوں اور اُن کے لکھنے والے دونوں کو کوئی کوڑی کے بھاؤ نہیں پوچھتا۔ کتاب لکھنے والوں کے ساتھ کتاب چھاپنے والوں کی بھی گنتی بڑھتی جاتی ہے۔ ہر آدمی جو یہ جانتا ہے کہ وہ چالاکی اور ٹھگی سے اس طرح جلد کچھ پیسے کما لے گا وہ پبلشر و بک سیلر بن جاتا ہے۔ پھر یہ لوگ کتاب لکھنے والوں کے ساتھ وہ دھاندھلی اور زبردستی شروع کرتے ہیں کہ لکھنے والا خون ہی تھوک کر مرتا ہے۔ اچھے بُرے لکھنے والوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ کتابوں کا بکنا بیچنے والے کی کوششوں پر منحصر ہوتا ہے۔ پھر اچھے اچھے لکھنے والے آنے اور ٹکے مزدوری پر پریس کے پروف، دیکھتے اور اس طرح اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسالوں میں اُجرت پر کہانی لکھنے والے ساگ بھاجی بیچتے نظر آنے لگتے ہیں[1]۔ اس لئے کہ رسالے والوں کو اُن کے بجائے کھاتے پیتے گھرانوں کے شوقین یا بدشوق لڑکوں لڑکیوں کے

---

[1] محض یہ مبالغہ نہیں ہے۔ ہمارے ایک چوٹی کے ادیب انھیں چیزوں

لکھے ہوئے افسانے چھپنے کے لئے مفت مل جاتے ہیں۔ اِس طرح فطینوں کی قوم ادب کے بازار سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور بمبئی جاکر سینما کے لئے بھیروِیں، لکھتی اور ملارؔ گاتی ہے۔ یہ لکھتے وقت مجھے اِس کا احساس ہے کہ ولایت وغیرہ میں بھی اچھے پایہ کے ادیب سینما کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن وہ لکھنے والے سینما کے لئے ناول اور کہانیاں لکھتے ہیں، 'بھیروِیں' نہیں لکھتے۔ اور اگر 'بھیروِیں' لکھنا ہی ہے تو ہم سب 'بھیروِیں' لکھنے کے لئے موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ ضروری ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور پنڈت شومترانندن پنت ہی بھیرویں، لکھیں تو بہتر ہوگا اگر ڈوب مرے یہ قوم۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر فطینوں کے ساتھ یہی ہونا ہے تو بہتر ہو کہ اِس قوم میں فطین نہ پیدا ہوں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ہم روک سکتے ہیں وقت کے اِس رُجحان اور طوفان کو؟ میرا جواب ہے "نہیں روک سکتے"۔ یعنی کیا ہم چھوٹ بیٹے لکھنا بند کر دیں گے محض اِس خیال اور احساس سے کہ اِس طرح ہم اپنے قومی فطینوں کو

سے پریشان ہو کر ناول اور کہانی لکھنے کے بجائے اِن دنوں ترکاری کا روزگار کر رہے ہیں۔ غریب ہو کر بھی آدمی غریب کہلانا نہیں چاہتا ورنہ میں اُن کا نام یہاں لے سکتا تھا۔

مارے ڈال رہے ہیں ؟ ہمارا جواب ہے، "نہیں رُکیں گے ہم اپنا لکھنا"۔ اگر فطین مر جائیں گے تو اُن کو مر جانے دیجئے اور ختم ہو جانے دیجئے۔ اُنھیں زمانہ کی بھینٹ چڑھ کر۔ لیکن آخر ہم اپنے بچوں کا گلا کیوں اور کیسے گھوٹیں ؟ ہمارے سامنے بھی سوال روٹی کا ہی ہے۔ ہم بھی پیٹ بھر کھانے کو چاہتے ہیں۔ چاہے فطین یا چھوٹ بھیئے ہوں، سوال سب کے سامنے پیٹ بھر کھانے کا ہے۔ اور یہ بھوک سرمایہ داری کی دین ہے۔ سرمایہ داری کو کچھ ہم ہی تھوڑے لائے تھے۔ انسانیت ہی اسے لائی تھی، اس لئے پوری انسانیت اس کی قیمت ادا کرے۔ جس سماج کو اس کی تمیز نہیں کہ کس کی کتابیں چھاپنی اور کس کی نہیں چھاپنی چاہیئے، کون کتاب اچھی اور کون بُری ہے، اُس سماج کو اسی آگ میں جلنا ہے جس میں وہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے جل رہا ہے۔ جہاں کتابیں نفع کے خیال سے چھاپی جاتی ہیں اور چھاپ کر صرف منافع ہی بڑھانے کے لئے پڑھے لکھے بزرگوں کو رشوت دے کر اُنھیں دکورس، میں کرایا جاتا ہے وہاں فطین نہیں پنپ سکتے۔ اِس لئے اچھا ہی ہوگا اگر اس دیش میں فطین نہ پیدا ہوں۔ اصل میں آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اُس میں ڈارون کا Survival of the fittest بھی، باوجود اپنی ساری خرابیوں کے، کام نہیں کر رہا ہے۔ ہماری

زندگی جس کشمکش کی آج شکار ہو گئی ہے وہ صرف چھوٹ بھیئے پیدا کر رہی ہے۔ چھوٹ بھیئے کے بیٹے بھی چھوٹ بھیئے ہو رہے ہیں اور اُن کے بیٹے بدترین چھوٹ بھیئے ہو رہے ہیں۔ یہ مشین کا دور ہے جب مشین کے پرزے بن جاتے ہیں تو مشین بن کر تیار ہو جاتی ہے۔

خیر، یہ تو ایک بیچ کی بات پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے کہنا یہ تھا کہ اس مجموعہ میں پانچ افسانے اور پانچ مضامین شامل ہیں۔ صرف افسانے یہاں اس وجہ سے نہیں ہیں کہ دس افسانے میرے پاس تیار نہیں تھے۔ لیکن چونکہ کتاب کو چھپانا تھا اس لیے افسانے اور مضامین ایک جگہ اکٹھا کر کے 'آنسو اور پسینہ' آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افسانے پڑھنے کے بعد مضامین پڑھتے وقت، لذت بدلتے رہنے سے، کچھ پڑھنے والوں کو خاص مزا آئے۔ اگر ایسا ہوا تو میری افسانہ نہ لکھنے کی مجبوری پھر کیا ہی گُل کھلائے گی۔

مجموعہ کا نام 'آنسو اور پسینہ' اس وجہ سے ہے کہ اس میں آنسو بھی ہیں اور پسینہ بھی، میرے ہی نہیں بلکہ اُن سب کے جو کسی نہ کسی شکل میں اس کتاب میں موجود ہیں۔

'سیلاب' میرا نیا افسانہ ہے، جس کے لکھنے میں فن اشاریت سے کام لیا گیا ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے درمیان انگریزی

پونجی اور مال ہندوستان میں اس کثرت سے آیا کہ اُس نے ہماری اقتصادی زندگی کو جیسے سیلاب کا شکار بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ یا تو ڈوب گیا یا بہہ گیا۔ اُس سیلاب سے جو بچے وہ بھوک، بخار، جاڑا، ہیضہ، پلیگ اور مقدمہ بازی سے تباہ ہوئے۔ غرضکہ 'سیلاب'، صرف افسانہ نہیں ہے، بلکہ اس میں آپ کو ہندوستان کی اُنیسویں اور شروع بیسویں صدی کی معاشی تاریخ ملے گی۔ افسانہ کے اخیر میں انگریزی فنِ طب کوٹ قمیض پہنے ہوئے 'بابو' کی شکل میں جاگیردار ہندوستان (Feudal India) کی نبض دیکھ کر اُس کی موت کا اعلان کرتا ہے۔

'زندگی'، ایک مذاحیہ مضمون ہے جسے میں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈکاسٹ کیا تھا۔ تقریر کا سلسلہ تھا، "بہت شور سنتے تھے ــــ"

'تلاش' بھی نیا افسانہ ہے، جس میں طوائف کی دُنیا کا دوسرا پہلو پیش کیا گیا ہے۔ 'زرینہ'، کی عام مقبولیت دیکھ کر مجھے شبہہ ہوا کہ شاید میں نے اُس افسانہ میں طوائف کی زندگی کے ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالی تھی ــــ اس لئے دوسرا پہلو بھی پیش کرنا ضروری ہو گیا۔ 'میرا پہلا براڈکاسٹ' بھی ریڈیو کے لئے ایک مزاحیہ مضمون تھا جو براڈکاسٹ نہ ہو سکا۔ لکھنؤ ریڈیو والے مذاحیہ تقریروں کا ایک سلسلہ چلا رہے تھے جس کا نام تھا "زندگی کی سُرخیاں"۔ لیکن میرے لکھنؤ نہ جانے کی وجہ سے یہ بات چیت براڈکاسٹ نہ ہو سکی۔

'سوچ' بھی نیا افسانہ ہے جس کے ہر کردار کو 'سوچ' کا گھن لگ گیا ہے۔ 'ہیرو' اس کا ایک کرانت کاری (انقلابی) ہے، جس کی موت نہایت ہی غیر انقلابی ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ سوچ نے سروج بابو کو مارا اور جو جی رہے ہیں انھیں بھی سوچ ہی مار رہا ہے۔ غرضکہ یہ افسانہ شروع سے آخر تک سوچ ہے۔

"میں کیسے لکھتا ہوں — کہانی" لکھنؤ ریڈیو سے براڈ کاسٹ کی ہوئی ایک بات چیت ہے۔ "میں کیسے لکھتا ہوں" تقریروں کے سلسلہ کا نام تھا اور مجھ سے کہانی لکھنے کے بارے میں بولنے کے لئے کہا گیا تھا۔ "اردو ناول اور افسانے" بھی ایک ایسی ہی ریڈیو کی بات چیت ہے، جسے میں نے ہندی کی دنیا کو خطاب کر کے براڈ کاسٹ کیا تھا۔ بات چیت کا سلسلہ تھا "چراغ تلے اندھیرا" جس میں اردو لکھنے والے ہندی کی دنیا کو اور ہندی لکھنے والے اردو کی دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اردو اور ہندی ادب میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔

'دعوتِ نظر' اور 'بیمار' ایک طرح سے میری پرانی کہانیاں ہیں، جو ہندی رسالہ وچار میں کبھی چھپی تھیں لیکن یہاں اس کتاب میں شامل کرتے وقت میں نے ان کو بالکل بدل ڈالا ہے، اتنا ہی جتنا کسی پرانی چیز کو بدلا یا سنوارا جا سکتا ہے۔ 'دعوتِ نظر' سے خاص دلچسپی نوجوانوں کو ہوگی اس لئے کہ یہ کہانی میری زندگی

کے ایسے ہی دَور کی لکھی ہوئی ہے۔ امید ہے کہ اس کی وجہ سے اس مخصوص سن کے پڑھنے والے اِس کتاب سے بالکل مایوس نہ ہونے پائیں گے! "بیمار"، ایک سنجیدہ مزاج نوجوان کی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے، خاص طور سے جب وہ حُسن اور عشق سے مایوس ہوکر "فولاد" کا کردار بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اُس کے لئے عورت بالکل سرکنڈے کی بنی ہوئی نہیں ثابت ہوتی، جیسا کہ وہ اپنے انقلابیت میں سوچے بیٹھا تھا۔

"آنسو اور پسینہ" نیا مضمون ہے جس کو میں نے خاص طور سے اِس کتاب کے لئے لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ یا سنجیدہ ہے، میں خود طے نہیں کر سکتا۔ اِس لئے اِس کا فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتا ہوں۔

رام پرتاپ بہادر

سیلاب

وہ گاؤں دریا کے کنارے، دریا سے لگا ہوا، پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اگر سوچیے تو پہلے اور آج میں بہت فرق ہے۔ یعنی پہلے اُس گاؤں میں منگو ساہو تھے اور اب وہ نہیں رہے۔ منگو ساہو آدمی تھے، گاؤں نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی اُس دریا کے کنارے، دریا سے لگے ہوئے گاؤں کو، جس کو آج بھی تھنتھین کہتے ہیں، منگو ساہو کو سوچے بغیر نہ پہلے کوئی سوچ سکتا تھا اور نہ اب سوچ سکتا ہے۔

جب منگو ساہو زندہ تھے تب ایسا تھا اور آج جب وہ نہیں رہے تب بھی ایسا ہے۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب ہم تھنتھین کو منگو ساہو کے دھن اور آس پاس میں پھیلے ہوئے اُن کے اثر اور دبدبے کو سوچ کر سوچتے تھے اور آج اُن کے نہ ہونے پر ہم تھنتھین کو منگو ساہو کی یاد کو تازہ کرکے سوچتے ہیں۔

دیہاتی بول چال میں تھنتھین کے مطلب ہوتے ہیں ٹھوٹھین، یعنی شہتیر، یعنی وہ لمبی، موٹی اور مضبوط لکڑی جس کو بنتے ہوئے

مکانوں کی دیواروں پر رکھ کر اُس کی کمر کے سہارے کھپریل یا
پھوس کی چھت بچھاتے ہیں۔ اُسی کو جب کنوئیں پر ڈال دیا جاتا
ہے تو اُس کے سینے پر پیر رکھ کر دیہاتی عورتیں پانی بھرتی ہیں۔
کہنے کا مطلب یہ کہ ٹھنٹھیں سچ مچ شہتیر تھا، کیونکہ آس
پاس کی پچاسوں میل کی دنیا کے لئے ٹھنٹھیں حقیقت میں شہتیر
کا کام کرتا تھا۔

ٹھنٹھیں راپتی ندی کے کنارے بسا ہوا ہے، اور راپتی
سال کے کسی موسم میں سوکھتی نہیں، اِس لئے کہ راپتی پہاڑوں
سے نکلتی ہے اور سو دوسو میل زمین کی نیچائی اونچائی پر بہہ کر سرجو
سے مِل جاتی ہے، اور پھر سرجو گنگا میں مِل جاتی ہے۔ اور اگر راپتی
سوکھ جاتی تو ٹھنٹھیں سوکھ جاتا کیونکہ راپتی ٹھنٹھیں کے لئے وہی
تھی جو شہتیر مکانوں کی چھتوں کے لئے یا کنوئیں پر پانی بھرنے والی
عورتوں کے لئے ہوتی ہے۔ جس طرح راپتی پر بہتی ہوئی تجارت
ٹھنٹھیں کی جان تھی اسی طرح ٹھنٹھیں اور مہنگو ساہو کی دولت اور
تجارت آس پاس کے پچاسوں میل تک پھیلے ہوئے دیہات کے
لئے شہتیر کی طرح سہارے کا کام کرتی تھیں۔
ٹھنٹھیں کے لئے مہنگو ساہو وہی تھے جو ٹھنٹھیں تھا مہنگو ساہو

کے لئے۔ بلکہ کچھ کا خیال تو یہ بھی تھا کہ منگو ساہو ہی تھنّیں تھے لیکن
خود منگو نے ایسا کبھی بھول کے بھی نہ سوچا کیونکہ وہ اپنے کو تھنّین
کی بدولت سمجھتے تھے۔ اُن کا ایسا خیال تھا جب اُن کے پاس دولت
تھی، بیل اور بیل گاڑیاں تھیں، گھوڑے اور ٹٹو تھے، اور جب
اُن کے دھن کی شہرت نیپال کی ترائی میں سے ہو کر گزرنے والے
سوداگر ہمالیہ پہاڑ کی وادیوں تک لے جاتے تھے اور اُن کے اُسی
نام کو، بوریوں میں بھر کر، راپتی سرجو میں لے جاتی تھی اور سرجو
اُنھیں گنگا کے دور دراز کناروں پر اُتارتی تھی۔

منگو مہاجن تھے، سوداگر تھے، ساہو تھے، زمیندار تھے، بھلے
آدمی تھے، کیا نہیں تھے۔ منگو کے وہاں لین دین ہوتی تھی، تجارت
ہوتی تھی، ہلدی بکتی تھی، کھیتی ہوتی تھی، لوگوں کی بات اور عزت
رہتی تھی۔ درجنوں اُن کے بڑے بڑے مکان تھے، سیکڑوں
مویشی تھے، سواریاں تھیں، اور اُن کے وہاں انگنت بھیڑ، بکریاں
کُتّے، طوطے، تیتر اور بٹیر پلے تھے۔ غرض کہ اُن کے پاس سب کچھ
تھا جو کسی بڑے آدمی کے پاس ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ نہیں تھا تو وہ
ہاتھی تھا، اور وہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ جس برادری کے منگو ساہو
تھے اُس برادری میں ہاتھی رکھنے کی جیسے خاندانی ممانعت سی تھی۔

اس لئے مہنگو ساہو جہاں سب کچھ رکھنے تھے وہاں صرف ہاتھی نہیں رکھنے تھے، ویسے ہاتھی کے خیال سے اُنھیں ایک طرح کا لگاؤ بھی تھا، جسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتے تھے۔

بچے سبھی ہاتھی کے تصوّر سے خوشی کے مارے پریشان ہو جاتے ہیں لیکن مہنگو کا ہاتھی سے جو ذہنی لگاؤ تھا وہ اُن کا بچپنا نہیں تھا بلکہ وہ لگاؤ خاص طور سے اُس دن سے شروع ہوا جس دن اُنھوں نے' دریا کے کنارے سے مرچوں کی بوریاں خرید کر لوٹتے وقت' ایک ننھے سے کھڑریچ[1] کو ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اُڑتے دیکھا۔ لیکن اگر باوجود اُس شگون اور مرچوں کے بھاؤ بڑھ جانے کے مہنگو ساہو راجہ نہیں ہوئے تو اُس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ اُن کے راجہ ہونے میں اُس کے بعد کچھ باقی رہ گیا تھا بلکہ مہنگو ساہو جوانی کی اُس صبح سے، جب اُنھوں نے 'کھڑریچ' کو ہاتھی

---

[1] کھڑریچ نام کی ایک چڑیا ہوتی ہے، جس کے بارے میں دیہاتوں میں کہیں کہیں ایسا یقین کیا جاتا ہے کہ اگر اُسے کوئی ہاتھی کے ماتھے کی اونچائی سے اُڑتے دیکھ لے تو وہ راجہ ہو جاتا ہے۔

کے مستک اتنی اونچائی سے اُڑتے دیکھا تھا، دن بدن اگر کچھ ہوئے تو صرف راجہ ہوئے۔ لیکن مہنگو نے راجہ ہو کر بھی اپنے کو راجہ کبھی نہ سمجھا۔ اِس کے پیچھے صرف برادری کی بات نہیں تھی۔ بلکہ مہنگو راجہ ہونے سے بھی اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا وہ ہاتھی رکھنے سے ڈرتے تھے۔

لیکن ہاتھی کے نہ ہونے نے مہنگو ساہو کو بے ہاتھی کے ہونے سے نہ روکا۔ بلکہ ہاتھی نہ رکھنے کے باوجود بھی جب سمے بدلا تو جہاں دوسرے ہاتھی رکھ کر مٹے وہاں مہنگو بنا ہاتھی رکھے مٹ گئے۔ جب وقت بدلتا ہے تو سب کے لئے بدلتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی کے لئے آج بدلتا ہے تو کسی کے لئے کل بدلتا ہے، کسی کے لئے کم بدلتا ہے اور کسی کے لئے زیادہ بدلتا ہے۔
جب مہنگو ساہو کے لئے زمانہ بدلا تو وہ پورے ٹھنٹھیں کے لئے بدلا، اور ٹھنٹھیں کے ساتھ ساتھ اُن ہزاروں لاکھوں کے لئے بدلا جو ٹھنٹھیں کے آس پاس صرف ٹھنٹھیں کی بدولت جیتے اور مرتے تھے۔ اصل میں وہ صرف زمانہ تھوڑے ہی بدلا تھا، بلکہ اُس کے ساتھ دریا کا دھارا بھی بدلا تھا۔ اور جب دریا کا دھارا بدلتا ہے تو وہ یک بیک آناً فاناً بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وہی

راپتی جو تھنھیں کے کنارے کنارے چُپ چاپ سال بہ سال بہا کرتی تھی اُس نے اپنا بہاؤ ایک برساتی رات میں یک بیک بدل دیا۔

اُس برساتی رات میں کیا کیا ہوا اور برساتی راپتی نے تھنھیں والوں کے ساتھ کیا کیا آج تھنھیں میں کم ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ اوّل تو اُس رات سے بچنے والوں میں آج کم رہے، اور جو ہیں بھی اُن میں سے کوئی بہرا، گونگا یا اندھا ہو چکا ہے تو کوئی ایک زمانہ سے لقوہ کا مریض بنا چارپائی پکڑے ہے۔ چنانچہ اگر آج ساٹھ اور نوّے اور بہتّر سال کی عمر میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی زبان اب بھی چلتی ہے تو وہ ہیں مھنگو ساہو۔ مھنگو ساہو آج بھی دریا کے کنارے، دن ڈوب جانے کے بعد، ملاحوں کے ساتھ گانجے کی چلم پی کر بتاتے ہیں کہ جب سیلاب آیا تو گاؤں والے سو رہے تھے۔ دریا یوں تو صبح ہی سے بڑھ رہا تھا اور تیز بڑھ رہا تھا۔ لیکن دریا ہر برسات میں بڑھتا تھا اور بڑھ کر گاؤں کے شوالے کا چبوترہ چھو کر گھٹنے لگتا تھا۔ شوالے کے برگد کی لمبی جٹائیں جب برساتی پانی پی لیتی تھیں اور برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے شیو جی کے چرن برساتی لہریں چھو لیتی تھیں تو پانی آپ سے آپ کھسکنے لگتا تھا۔ چنانچہ جب سیلاب آیا تو گاؤں

الے سوئے ہوئے تھے۔ مہنگو ساہو بتاتے ہیں کہ رات میں
یک دم شور مچا۔ لوگ بے تحاشا مکانوں سے نکل کر بھاگنے
لگے۔ لیکن باہر نکل کر گاؤں والوں نے دیکھا کہ گاؤں پانی سے
بھر چکا تھا۔ پانی زور سے گاؤں میں گر رہا تھا۔ اُس کے شور
سے کچھ اور سُنائی نہ پڑتا تھا۔ صرف عورتوں بچّوں کا رونا چلّانا اور
دیواروں کا دھما دھم گرنا سُنائی دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جیسے
پورا گاؤں بہہ چلا۔ مہنگو ساہو جھپٹ کر اندر گئے اور تیتر کا
پنجرا باہر نکال لائے۔ پھر اپنی لڑکی اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر
انھوں نے چاہا کہ سامنے کی لیک کو، جس پر پہلے بیل گاڑیاں
چلتی تھیں، پار کر کے دوسری طرف نکل جائیں۔ لیکن لیک
مر بن چکی تھی اور پانی اُس میں زور مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔
بیوی کا ہاتھ ساہو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دھارے
کے ساتھ بہتی نکل گئیں۔ مہنگو ساہو تیتر کا پنجرا چھوڑ کر تیرنے
لگے۔ لڑکی نے مہنگو کی صدری پکڑ لی۔ جب مہنگو سامنے والے
ٹیلے پر پہنچے تو لڑکی کی ساڑی میں اُلجھا ہوا تیتر کا پنجرا بھی
کنارے لگا۔ رات کے اندھیرے میں مہنگو ساہو نے دیکھا
پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ گائے، بیل، بکریاں اور آدمی

بہتے چلے جا رہے تھے۔ مہنگو نے سامنے کے درخت پر لڑکی کو
بڑی محنت سے چڑھا دیا، اور خود بھی تیتر کا پنجڑا لے کر ایک
ڈال پر جا بیٹھے۔ صبح تک گاؤں کا تین چوتھائی حصّہ دریا
کاٹ کر بہا لے گیا تھا۔ جو حصّہ بچا تھا وہ ملاحوں اور چماروں
کی بستی تھی، جسکے صرف چھپّر پانی کے اوپر دکھائی دیتے تھے۔
آس پاس کی دنیا پانی کی دنیا بن گئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں
کی اوپر کی صرف شاخیں دکھائی پڑتی تھیں۔ مہنگو نے تیتر کے
پنجڑے کو ایک شاخ پر لٹکا دیا تھا، اور اس طرح وہ دو راتیں
اور ایک دن درخت پر بیٹھے رہے۔ لیکن لڑکی دوسری رات
کو اونگھ کر پانی میں گر پڑی۔ درخت کے نیچے پانی سوں سوں
کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ لڑکی کے پانی میں گرنے سے جو دھماکا ہوا
اُس سے مہنگو سا ہو، جو خود جھپکی لے رہے تھے، جاگ اُٹھے۔
لیکن دھارے کی تیزی دیکھ کر ہمّت نیچے اُترنے کی نہ ہوئی۔
لڑکی تیسرے دن ایک بہتے ہوئے کیلے کے تنے سے لپٹی ہوئی
کئی میل کی دوری پر زندہ پائی گئی۔

سیلاب جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے گھٹنے لگا۔
ڈیڑھ دن میں دریا اپنے پیٹ میں آگیا۔ گاؤں میں دس بیس

آدمیوں کو چھوڑ کر، جو درختوں پر لٹکے ہوئے تھے، کچھ نہ بچا تھا۔ شوالہ گر کر دریا کے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ مہادیو جی بکھرے ہوئے اپنی جگہ پر پڑے تھے۔ گاؤں کے بابو صاحب کا ہاتھی، جو شیوالے کے پاس برگد تلے بندھتا تھا، برگد کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تیرہ میل کی دوری پر مُردہ سرجو کے کنارے بہتا پایا گیا۔

اتنا قصہ سنا کر منگو ساہو نے صدری سے گھڑی نکالی اور اُپلے کنڈے کی آگ کے پاس لے جا کر دیکھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اس لئے تیتر کا پنجڑا اُٹھا کر دریا کے کنارے سے چل دیئے۔

ٹھیک تو کوئی نہیں بتا سکتا، لیکن ایک زمانہ سے منگو ساہو اسی طرح شام کے وقت دریا کے کنارے جاتے تھے، ایک ہاتھ میں تیتر کا پنجڑا اور دوسرے ہاتھ میں سوٹا لئے ہوئے۔ دریا کے کنارے ضروریات سے فارغ ہوتے اور پھر ملاحوں کے ساتھ گانجا پی کر سیلاب سے پہلے اور سیلاب کے بعد کی تنخمیّن کی کہانی سناتے تھے۔ پوری کہانی ملاحوں کو کبھی معلوم نہ ہو سکی کیونکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس طرح اپنی یا تخمیں کی داستان سنا کر منگو اپنی آنکھوں کی گھٹتی ہوئی روشنی سے، کنڈے کی آگ کے پاس اپنی گھڑی لے جا کر، وقت دیکھتے اور گھڑی میں آٹھ بجا دیکھ کر دریا

کے کنارے سے چل دیتے۔ پوری کہانی شاید کبھی ختم ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ مہنگو ساہو اور اُن کی ہر چیز دریا پر ناؤ چلانے والے ملّاحوں کے لئے نہ ختم ہونے والے داستان تھے۔

وہ اپنی گھڑی کے بارے میں بتاتے تھے جسے مع چین کے صدری کے سامنے کی جیب میں ہمیشہ لئے رہتے تھے۔ کہ اُسے اُنھوں نے ایک نیپالی سوداگر سے خریدی تھی۔ گھڑی کے علاوہ اُن کے پاس ایک کمبل بھی تھا جس کے روئیں اُڑ گئے تھے، لیکن اندر کی اُونی خول اب بھی باقی تھی، جس پر بال جما کر وہ کمبل بنا تھا۔ مہنگو ساہو بتاتے، گھڑی جرمنی میں اور کمبل ولایت میں بنے تھے اور یہ دونوں چیزیں اُنھوں نے اُسی نیپالی سوداگر سے خریدی تھیں جو، بقول مہنگو ساہو، ہر پانچ سال پر ٹھنصبس سے ہو کر بدیشی مال لئے گذرتا تھا۔ راستہ میں کبھی وہ سوداگر اپنا کوئی مال بیچتا نہ تھا۔ ساری بدیشی چیزیں نیپال لے جا کر صرف مہاراجہ اور بڑے اور چھوٹے سرکاروں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ مہنگو ساہو کے واسطے صرف اُس کا پریم تھا جو اُس نے ایک بار کمبل اور گھڑی اُن کے ہاتھ بیچ دی تھی۔ گھڑی اور کمبل کی تعریفیں کرتے ہوئے مہنگو کمبل کی عمر لگ بھگ ۴۸ سال بتاتے اور کہتے کہ وہ ولائتی کمبل اتنا

رم تھا کہ اُسے بدن پر ڈال کر اگر کوئی جاڑے کی رات میں باہر میدان
میں بھی پڑا رہ جائے تو سردی نہیں لگ سکتی تھی ۔ اسی طرح گھڑی کی
بھی کہانی سُناتے، جس کو دیکھ کر منگو ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ
سورج ٹھیک وقت پر نکلا ہے یا نہیں ۔ وہ کہتے تھے کہ تیس سال
سے گھڑی نہ کبھی بگڑی اور نہ کبھی مرمت کو گئی ۔ باتوں میں وہ یہ بھی
بتاتے کہ اگر گھڑی میں کُنجی نہ دی جائے تب بھی وہ چلتی رہتی تھی ۔
حالانکہ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی، اپنی یا گھڑی کی تعریف میں، کہہ دیتے
کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ اپنی گھڑی میں کُنجی دینا بھول گئے ہوں ۔
وہ بتاتے تھے کہ سیلاب سے گھرے ہوئے جب وہ درخت پر بیٹھے
تھے تب بھی گھڑی میں کُنجی لگانا نہیں بھولے ۔ سیلاب آنے پر جب وہ
گھر سے نکل بھاگے تو گھڑی صدری میں تھی اس لئے وہ تینتر کی طرح
اُن کے ساتھ چلی آئی ۔ کمبل اُنھیں سیلاب کے بعد گری ہوئی دیوار
کے نیچے ملا ۔ جہاں سیلاب میں اور بھاری چیزیں سڑ گل یا بہہ گئیں وہاں
اکیلا کمبل تھا جو پانی میں بھیگ کر اپنا وزن لئے وہیں رہ گیا ۔ منگو
سا ہو کی نظر میں اُس کمبل کی یہ بھی ایک بڑی خوبی تھی جو اُسے اتنا
بڑا سیلاب بھی نہ بہا سکا ۔ اور جو اُس کے بال جھڑ گئے تھے اُس کے بارے
میں اُن کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ دیوار کے نیچے دب نہ جاتا تو اُس کے

بال ہرگز نہ گرتے کیونکہ جرمن گھڑی کی طرح ولایتی کمبل بھی امر تھا۔ نیپال کے سوداگر نے ایسا ہی بتایا بھی تھا۔ ملاحوں نے گھڑی تو دیکھی تھی لیکن کمبل انھوں نے کبھی نہ دیکھا۔ مھنگو ساہو جب یہ داستان سُناتے تو ہمیشہ کہتے "کمبل بھی کسی دن دکھاؤں گا" لیکن ملاحوں کے لئے وہ دن کبھی نہ آیا۔

اِتنی داستان سُنا کر مھنگو نے نیپال کے سوداگر کی دی ہوئی گھڑی نکال کر دیکھی اور کہنے لگے۔ سیلاب بھی نیپال ہی سے آیا تھا نیپال میں چاروں طرف پہاڑیوں سے گھِرا ہوا ایک بہت بڑا تال تھا، جس میں برسات کا پانی اکٹھا ہوتا تھا۔ اُس سال نیپال میں اتنے زور کی بارش ہوئی کہ تال میں زیادہ پانی اکٹھا ہو جانے سے آس پاس کی دھان کی کھیتی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تالاب کا ایک باندھ کاٹ دیا گیا۔ راپتی یوں ہی بڑھی ہوئی تھی۔ باندھ کے ٹوٹنے سے پانی دندناتا ہوا آیا۔ تھنمیں کا تین چوتھائی دیکھتے دیکھتے راپتی کے پیٹ میں ہضم ہو گیا۔ سیکڑوں گاؤں اور ہزاروں آدمی راتوں رات بہہ گئے۔ جنھوں نے بھاگنے یا تیرنے کی کوشش کی وہ دو چار میل آگے جا کر ڈوبے۔ بچا کوئی نہیں۔ سوائے اُن کے جو اُن درختوں یا مکانوں پر چڑھ گئے تھے جنھیں

سیلاب گرا یا بہا نہ سکا۔لیکن جو اس طرح بچ گئے اُنھوں نے
بچ کر بھی یہی محسوس کیا کہ جو نہیں رہے تھے وہی اچھے رہے، کیونکہ
جو رہ گئے تھے اُن کے لئے زندگی خود ایک مستقل سیلاب بن گئی جن میں
جینے والے دن رات ڈوبتے اُتراتے رہے۔

اُنھیں بچنے والوں میں منگو بھی تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی
اس مرنے کے ہاتھوں جی کر یہی محسوس کیا کہ اگر وہ نہ بچے ہوتے تو
اچھا نہ ہوتا۔لیکن ایسے جینے کو بھی جینا ہی کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح
جینے والا بھی اپنی زندگی موت سے نہیں بدلتا۔سیلاب کے بعد گاؤں
میں بخار کی بیماری چلی تھی۔ جو سیلاب سے بچے تھے وہ بخار سے مرے۔
اور جو بخار سے بچے وہ بھوک کے مارے کتوں، بلیوں کی موت مرے۔
اپنے گھر میں رہ گئے تھے، اپنی لڑکی کے علاوہ صرف منگو ساہو۔لیکن
منگو نے چونکہ اس درمیان میں یہ طے کر لیا تھا کہ آخر میں کوئی کسی کا
نہیں ہوتا اور آدمی کو اپنی زندگی کا بوجھ آپ ہی ڈھونا پڑتا ہے، اس
لئے جب ہیضہ کی بیماری سے اکیلی لڑکی بھی چل بسی تو منگو زیادہ
ہمت نہیں ہارے۔ہاں سر کے چند بال جو کالے رہ گئے تھے وہ بھی
سفید ہو گئے۔چہرے پر جو جھریاں تھیں وہ مل کر لکیریں بن گئیں۔
بڑھاپے میں آدمی کا رنگ یوں بھی معنی نہیں رکھتا۔لیکن منگو ساہو کے

بارے میں اب یہ بھی آسانی سے نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ وہ تھے کس رنگ کے۔ کپڑے لتّے پہلے بھی زیادہ نہیں پہنتے تھے اور اب ۹۶ سال کی عمر میں پہنتے بھی تو کیا پہنتے۔ لے دے کے، دھوتی کے علاوہ صدری رہ گئی تھی، جسے اب پہنتے کم کندھے پر ڈالے زیادہ رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ میں وہ سوٹا رہتا جس پر جھک کر اب اُن کا بڑھاپا چلتا تھا۔ اور جب دریا کے کنارے صبح شام جاتے تو داہنے ہاتھ میں پنجڑا بھی ہوتا، جس میں وہ تیتر تھا، جسے مہنگو ساہو اپنی جان کے ساتھ اُس سیلاب میں سے بچا لائے تھے۔ پنجڑا وہی رہا، لیکن تیتر بدلتے رہے۔ تیتر اتنے دن جیتا بھی کیسے۔

مہنگو ساہو کے پاس جب سب کچھ تھا تب بھی وہ صبح شام دریا کے کنارے جایا کرتے تھے اور جب اُن کے کچھ بھی نہ رہا اور اُن کا کوئی نہ رہا تب بھی اُن کے لئے وہی دریا کا کنارہ تھا۔ یعنی دریا کے کنارے جانا جیسے اُن کے جینے کا بہانا تھا۔ دریا میں نہاتے، سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے ایک لوٹا پانی گرا کر کچھ گنگناتے پھر گاؤں کے دوسرے نہانے آنے والوں سے باتیں کرتے۔ دریا کے اِس پار سے اُس پار، اور اُس پار سے اِس پار آنے والوں سے دیس کال کا حال پوچھتے۔ تیتر کو پانی پلا کر اُسے ریتیلی اودی زمین پر

دیمک کھانے کو چھوڑ دیتے۔ دُور دُور بازاروں میں بکنے جانے والی چیزیں جو کشتیوں سے اُترتی رہتیں اُن کا بھاؤ پوچھتے۔ اِس طرح وہ روز صبح شام۔ ہاتھی سے لے کر بٹیر تک، ہر چیز کے دام پوچھتے جو اُدھر سے گذرتی۔ پھر واپس آکر گھر میں پڑ رہتے۔

دن رات کا بقیہ حصّہ وہ کہاں اور کس طرح گذارتے یہ گاؤں والوں میں کم ہی کو یا شائد کسی کو بھی نہ معلوم تھا۔ مہنگو سا ہو اب کیا کھاتے اور کیا کماتے تھے یہ بھی کسی کو کیا معلوم ہوتا۔ اور اگر مہنگو کے اُس بھید سے کوئی واقف ہو سکتا تھا تو وہ اُن کا تیتر تھا، جو گھر میں مہنگو کا اکیلا ساتھی تھا۔ جب دیوار کی نیو کھسک جاتی ہے تو کسی اور سہارے نہیں ٹھہرتی۔ اور جب کسی کا زمانہ بدلتا ہے تو عموماً اچھّی طرح بدلتا ہے۔ چنانچہ سیلاب نے جہاں سارا دھن دولت لے لیا وہاں سمے نے اپنے جان میں مہنگو کو جینے کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ تین گاؤں کی زمینداری دریا نے کاٹ کر اُس پار کے زمینداروں کے حصّوں میں ڈال دیا تھا۔ شیوالہ کے پیچھے مہنگو کا جو پکّا مکان تھا وہ شوالہ کے ساتھ راپتی کے دھارے میں آگیا تھا۔ اور جب شیوالہ ہی گر گیا تو مہنگو کا مکان گرنا کیا بڑی بات تھی۔ یعنی جب بھگوان ہی پر آفت آئی تھی تو آدمی کا رونا کیا رونا۔ جُگ جُگ سے تصحیب دانے ماتتے

آئے تھے کہ چاہے دنیا ڈوب جائے لیکن شیوالہ کو آنچ نہیں آسکتی تھی اس لئے آج جب شیوالہ نہیں رہا تو ٹھنٹھیں کیسے رہتا۔

مہنگو کے گھر میں جو دولت تھی اُس پر سے اب دریا بہہ رہا تھا۔ کمبل کے علاوہ اگر کوئی اور چیز ملی تو وہ اُن کی بہی تھی، جس میں اُن کے لین دین کا حساب رہتا تھا۔ لیکن جو بہی مہینوں کیچڑ اور پانی کی ہوکر رہ چکی تھی اُس میں آدمی کا حساب بھی کیا ملتا۔ پیسہ مہنگو کا کس نے نہیں کھایا تھا لیکن کس کے پاس کیا رہ گیا تھا جو مہنگو کسی سے پیسہ مانگتے۔ رگھو کُل شُکل نے اُنھیں اکثر یہ سمجھایا کہ قرض داروں کو نوٹس دے کر ثبوت کے لئے عدالت میں بہی جمع کر دو۔ لیکن پہلے عدالت میں جانا جو مہنگو سا ہو اپنی عزّت اور شان کے خلاف سمجھتے تھے اُنھوں نے اب دھن اور عزّت نہ رہنے پر رگھو کُل شُکل کی بات پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے کہ حقیقت میں وہ عدالت سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ جو دعویٰ کئے بیٹھے تھے اُنھیں ہی کیا کچھ ملا جاتا تھا اُنھوں نے صبر کر لیا۔ رگھو کُل کو اُنھوں نے یہ سمجھایا کہ عدالت کے سامنے بہی کی کیچڑ میں سَنی ہوئی ڈھیری کی کالکھ کی لکھائی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

لیکن جہاں مہنگو کی بہی دوسروں کے خلاف نہ چل سکی وہاں

دوسروں کی بہیاں مہنگو کے خلاف خوب ہی چلیں اور ایسی چلیں کہ
ہاسہا زمینداری کا حصّہ اس طرح بِک گیا۔ راپتی سے لے کر سرجو کے
کنارے تک جس جس کے روکڑ میں تین ہزار کی ہلدی، ساڑھے چار
ہزار کی مرچ، سات ہزار کا نمک اور نو سو ننّانوے کا گڑ لکھا تھا وہ
سب سوُد درسود چھوڑ کر مہنگو نے سُوت سُوت بیچ کر ادا کرنا اپنا دھرم
سمجھا۔ چونکہ آدمی روزگاری تھے اس لئے سوچا زبان اور بات پر
اڑے رہو، سمے بدلے گا تو یہی ایک کا تین دسے کر جائے گا۔ چنانچہ
مہنگو جب صبح و شام بہی سامنے رکھ کر اپنے دھن یا پونجی کا میزان
لگاتے تو گھڑی، کمبل اور جھونپڑی کے علاوہ، جس میں اب وہ رہتے
تھے، دو ہی چیزیں اور یاد آتیں۔ بیس آنے کا تینسر اور دانت کھودنے
والی اُن کے گلے میں لٹکی کھودنی جس کی قیمت چاندی کا بھاؤ گھٹ
جانے سے اب بیس پیسوں سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اب بھی
ہر سال دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت گوبر سے اندر کا برآمدہ
لیپ کر بہی لے کر وہ بیٹھتے تھے اور کسی سادہ پنّے پر روکڑ کے کھاتے
میں انھیں پانچ چیزوں کا اندراج کر لیتے تھے۔

دیوالی سے پہلے دسہرہ آتا ہے اور دسہرے کے دن صبح کو گاؤں
کا چرٹی مار اب بھی مہنگو کو نیل کنٹھ دکھانے لاتا تھا۔ اس لئے آج دوپہر

ہمک وہ چڑیمار کی راہ دیکھتے رہے لیکن جب دن گذر گیا اور چڑیمار نیل کنٹھ دکھانے نہیں آیا تو شام تک منگو بہت اُداس ہو گئے۔
جب دن ڈوبنے سے پہلے چھپر کے بانس میں سے تیتر کا پنجرا اُتار رہے تھے تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ جیسے کمر میں سکت نہ رہی۔ پنجرا اُتارتے وقت جانگھیں کانپنے لگیں۔

ایک ہاتھ میں پنجرہ اور دوسرے میں سوٹا لے کر جس وقت وہ مکان سے باہر نکلے تو سامنے کے درخت پر سے ایک نیل کنٹھ "قیں قیں" کرتا سیدھے زمین پر آیا۔ منگو سا ہو کے بیر رُک گئے۔ لیکن چونکہ دریا جانا تھا اس لیے اُس بدشگون کے باوجود گئے۔ راستہ بھر یہی سوچتے رہے کہ دسہرے کے دن شام کے وقت نیل کنٹھ اوپر سے اُڑ کر نیچے کیوں آیا۔ اُسی وقت کھیڑ رنج کا ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اُترنا بھی یاد آیا۔

دریا کے کنارے ملاحوں کے ساتھ دو چلم گانجہ پی کر جب وہ بابو صاحب کے ہاتھی کا سیلاب میں بہہ کر مرنا بتا رہے تھے تو تیسری چلم کا دم کھینچتے کھینچتے جیسے اُن کا دم چھوٹ گیا۔ ہوش کھوتے کھوتے اُنھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے دریا کے اُس پار درارے میں سے جو اُلّو اُڑا تھا اُس کی آواز اُن کے کانوں میں "کھڑ رنج کھڑ رنج"

کہہ رہی تھی۔

ملّاحوں کی پریشانی دیکھ کر کوٹ قمیض پہنے ہوئے بابو، جو اُسی وقت کشتی سے اُترے تھے آ گئے۔ جس وقت وہ مہنگو ساہو کی نبض دیکھ رہے تھے اُن کی نظر مہنگو کی گھڑی کی چین پر پڑی۔ نبض ہلکی چل رہی تھی اِس لئے مہنگو کی گھڑی ہاتھ میں لے کر نبض گننے لگے۔ لیکن جب سکنڈ کی سوئی چلتی نہیں دکھائی دی تو اُنھوں نے گھڑی کان پر لگائی۔ ملّاحوں نے بتایا کہ گھڑی بولتی نہیں لیکن وقت ٹھیک بتاتی تھی۔ جو گھڑی سیلاب ہی کے وقت سے بند تھی اُس کی گھنٹے والی سوئی کو آٹھ پر دیکھتے ہوئے بابو نے کہا۔ "ہاں، اِس وقت تو وقت ٹھیک بتا رہی ہے"۔ جب نبض کی طرف اُنھوں نے دھیان دیا تو وہ بند ہو چکی تھی۔

زندگی

اپنی پیدائش اور اُس سے پہلے کے واقعات سے میں اتنا ہی واقف ہوں جتنا آپ ہوں گے، یعنی بالکل نہیں ہوں۔ بس کچھ سُنی سُنائی باتیں ہیں، جن کا یقین اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ پیدائش کے موقع پر اس دیش میں عام طور سے یہی سب ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جس کے وہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اُس کے یہاں خوشی منائی جاتی ہے، سوائے ایک برادری کے جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ تو کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ میرے گھر میں بھی خوشی منائی گئی۔ یعنی تھالیاں بجیں، بندوق چھُٹی، گانا بجانا ہوا، وغیرہ وغیرہ۔

باوجود اس مستقل رونے کے کہ مُلک کی آبادی بھینکر شکل سے بڑھ رہی ہے، جب بیٹا ہوتا ہے، یعنی جب بیٹی نہیں ہوتی ہے، تو سبھی خوشیاں مناتے ہیں۔ چنانچہ میری پیدائش بھی میرے گھر والوں کے لئے نہایت ہی مبارک چیز تھی۔ یہی نہیں بلکہ، اگر گستاخی معاف ہو تو، میں یہ بھی عرض کروں گا کہ میری پیدائش سے میرے گھر والوں کو جتنی خوشی ہوئی اُتنی شاید آپ کی پیدائش سے

آپ کے گھر والوں کو خوشی نہ ہوئی ہو۔ وہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ مجھ سے پہلے میرے سات بہنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب میرے والد کو لڑکے کی کوئی اُمید نہ رہ گئی تو اُنھیں مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی۔ لیکن جب دوسری شادی سے بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ زندگی اور اپنے دونوں سے مایوس ہو گئے۔ بیٹا، بیٹی میں کیا فرق، اور ویسے سوچیے تو بہت فرق ہے۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ کہ دونوں خدا کی دین ہیں، اور اُن کی مرضی کوئی کیسے بدل سکتا ہے۔ پھر بھی آرزو منّت تو ہو ہی سکتی ہے، وہ مانیں یا نہ مانیں۔ بلکہ کچھ دیوی دیوتا تو ایسے بھی ہیں جن کی ایک حد تک سفارش بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میرے والد نے بھی تیرتھ برت کیے، سادھو، مہاتماؤں کے درشن کیے، چرن چھوئے۔ اور جب میں پیدا ہوا تو دسہرے سے ایک دن پہلے چودہ کالے بکروں کی چودہ گردنیں دیوی دُرگا کے چبوترے پر ایک ساتھ گرا دی گئیں۔

میری سواری کے لئے میرے والدین نے جو گاڑی خریدی تھی، جسے آپ اپنی زبان میں "پریم" کہتے ہیں، اُس پر جاڑے کے موسم میں شام کے وقت بیٹھا بیٹھا جب میں شکر قند کھاتا تھا تو اپنے والدین کی صرف ایک یاد آتی تھی، یعنی جب میری والدہ کی لاش

گھر کے باہر نکالی جا رہی تھی تو میں زمین پر بیٹھا بھُنے ہوئے چنے کھا رہا تھا۔ پتا جی کب مرے، یہ تو معلوم نہیں۔ ماں کا مرنا بھی بھُنے ہوئے چنے کھاتے وقت تو معلوم نہ ہوا تھا۔ لیکن جب میرا چھوٹا بھائی میری گاڑی پر چڑھنے اور میں نیچے اُتر کر زمین پر چلنے لگا تھا تب یہ معلوم ہوا کہ ماتا پتا دونوں مجھے بغیر بتائے ہوئے اس دُنیا سے چل بسے تھے۔ غرض کہ سر منڈے کئے کہ اولے پڑے۔ والدین کی زمینداری پر دوسروں نے قبضہ جمالئے۔ گھر میں جو تھا چور اُٹھا لے گئے۔ کایستھ بنک کا سارا روپیہ چونکہ دُور اندیش کایستھوں نے ایک ہی دن میں نکال لیا، اس لئے نہ بیچارہ کایستھ بنک رہا اور نہ میرے نام کا روپیہ۔ تعلیم میری "کریما" سے شروع ہوئی۔ مولوی صاحب جن کی تعلیم خود یکّہ ہانکنے سے شروع ہوئی تھی، جب "ما مقیما" مجھے پڑھا رہے تھے تو اُسی وقت بڑے زور کا پلیگ گاؤں میں آیا۔ اس لئے انگریزی پڑھانے کے بہانے ہم دونوں بھائی پکڑ کر شہر بھیج دیئے گئے۔ ہم لوگوں کے شہر چلے جانے کے بعد مولوی صاحب پھر یکّہ ہانکنے لگے، اور آج بھی یکّہ ہانکتے اور افیون کھاتے ہیں۔

آپ کہیں گے جو زندگی اس طرح شروع ہوئی ہو، اُس سے زیادہ امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ کا ایسا سوچنا غلط

ہوگا، اس لئے کہ میری سمجھ میں زندگی امید کی محتاج نہیں ہوتی، کیونکہ زندگی خود اُمید ہوتی ہے جب اُمید نہیں رہ جاتی تو آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔ خودکشی کرنے والے کو دنیا پاگل کہتی ہے۔ لیکن میں کوئی پاگل تھوڑے ہی ہوگیا تھا۔ اِس لئے چاہے آپ میرا وشواس نہ کریں لیکن پھر بھی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے جینے کا سلسلہ جو اِس طرح چل نکلا تھا وہ میرے والدین کی موت کے باوجود بھی، ویسے ہی بے روک چلتا رہا۔ سمجھ لیجئے بس ایسے ہی جیسے کیلا، بچھو اور بانس کی سنتا نیں کیلا بچھو بانس کے بعد بھی چلتی رہتی ہیں۔ بہرحال میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ میری زندگی کا سلسلہ لگ بھگ ویسے ہی چلتا رہا جیسے شاید پہلے چلتا۔ اگر کوئی فرق تھا تو اتنا کہ پہلے شاید جوتے پہن کر اسکول جاتا تو اب ننگے پیر جاتا تھا۔ کبھی کبھی مٹی کا تیل نہ ہونے سے لالٹین بھی نہ جلتی تھی۔ لیکن میں کوئی راما نجن تھوڑے ہی تھا جو سڑک پہ جاکر میونسپل لیمپ کے نیچے حساب لگاتا۔

بس پڑھتے رہے، پاس ہوتے رہے، فیل بھی ہوتے تھے۔ پاس ہونے کی خوشی ہوتی، فیل ہونے کا افسوس ہوتا۔ لیکن آج تو کچھ ایسا سوچتا ہوں کہ اگر اور فیل ہوا ہوتا یا ہمیشہ فیل ہی ہوتا

رہتا تو آج زندگی کے امتحان میں کم پاس ہونے کا شاید افسوس زیادہ نہ ہوتا۔ بہر حال پڑھتے تھے، لکھتے تھے، نہیں بھی پڑھتے لکھتے تھے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہاوت ہے، "دن بھر بھیک مانگیے تب دیا بھر، نہ مانگیے تب بھی دیا بھر" کچھ اسی قسم کا میرا پڑھنا لکھنا بھی تھا اور تقریباً اسی قسم کی میری زندگی بھی تھی۔ لیکن اصلی زندگی تو وہ تھی جو رات میں چارپائی پہ پڑ جانے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ بستر پر پڑا ہوں، آنکھیں بند ہیں، لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بہت بڑا میچ ہو رہا ہے کبھی ہاکی کا ہے، کبھی فٹ بال کا۔ میں ہوں کہ گیند لئے بھاگتا ہی جاتا ہوں، تالیاں بج رہی ہیں، ہزاروں لاکھوں تالیاں۔ مارا دھڑاک سے، گول ہو گیا سیٹی بج گئی۔ کھیل کے میدان کے کنارے کنارے سینکڑوں ٹوپیاں، جوتے، چھلتے اور ڈنڈے اچھلنے لگے۔ کچھ لڑکوں نے دوڑ کر مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ دوسری ٹیلی، ہوتے ہوتے میں سو گیا۔

بہر حال ستاروں سے شرما کر بھی میں رکا نہیں۔ سورج کو دیکھ کر ڈرا نہیں۔ بادلوں کی گرج سے میں گھبرایا نہیں۔ آسمان کو دیکھ کر میرے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ میں تھا کہ اپنی

زندگی کی شاہراہ پر چلتا ہی جاتا تھا۔ میں تھا اور میری زندگی تھی۔ کبھی پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ہزاروں لاکھوں مردوں، عورتوں کو اکٹھا کر کے لکچر دیتا تھا۔ کبھی دھیان چند کی طرح ہاکی کھیلتا تھا۔ اور جو آگے بڑھا تو عمر ہی کا وہ بھی تقاضہ تھا جو کہیں کسی سنسان میں اکیلے چپ چاپ بیٹھ کر کسی کے تصوّر کو پیار کرنے لگا۔ چپکے چپکے خاموش باتیں ہوتیں۔ کبھی شہر سے دور جا کر پارک کے درختوں سے اپنا بھید کہتا، چڑیوں کے گانے سنتا۔ بیٹھے بیٹھے تنکے توڑتا اور جوڑتا۔ پھر کسی کے تخیل میں وہاں سے چل دیتا۔ قدم ہمیشہ گھر ہی کی طرف اُٹھتے۔ اندھیری سنسان سڑکوں پر جب ڈر لگتا تو 'گائینتری' منتر پڑھنے لگتا اور اس طرح چلتا چلتا گھر چلا آتا۔

پڑھنے کا شوق تو 'سکینڈ ڈویژن' میں دسواں درجہ پاس کر کے پیدا ہوا۔ اور پھر "سکینڈ ڈویژن" سے اتنی محبت ہو گئی کہ "فرسٹ ڈویژن" کو کبھی بھول کے بھی نہ سوچا۔ پھر پڑھنا لکھنا کیا ہو گیا کہ سیڑھی کا چڑھنا تھا۔ ایک سیڑھی پر چڑھ کے دوسری سیڑھی کے لئے قدم آپ سے آپ اُٹھ جاتے۔ چنانچہ اُن سیڑھیوں کا سلسلہ آج بھی ختم نہ ہوا، اور غضب تو یہ ہے کہ آج آپ سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اِس وقت دراصل ہوں کس سیڑھی پر۔

غرض کہ بے ڈھنگی زندگی کا سلسلہ جس طرح شروع ہوا تھا اُسی بے ڈھنگے طریقے سے چلتا رہا۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے وہ سب کچھ ہوا جو دنیا میں ہوتا ہے۔ یعنی شادی ہوئی، اس لئے کہ وہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ سب ہوا جو شادی ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ بیوی پاکر خوش ہوا، بہت خوش ہوا۔ ناخوش بھی ہوا اور بہت ناخوش ہوا۔ اور اگر آپ یہ پوچھیں کہ اب کیسے ہیں تو جواب دوں گا، بس یوں ہی ہوں، یعنی نہ خوش ہوں نہ ناخوش ہوں۔ زیادہ کہہ بھی نہیں سکتا اس لئے کہ بیوی کا ڈر ہے۔ لیکن اس میں بیوی کا بھی کیا قصور؟ شادی سے ہمیشہ خوش رہنے والے کو میں بالکل ایماندار آدمی بھی تو ماننے کو تیار نہیں۔ اور اگر آدمی ایماندار ہے تو پھر اُس میں شئے لطیف کی کچھ کمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح میں اپنی شیروانی یا قلم سے ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا ہوں اُسی طرح اپنی بیوی سے بھی ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ میری دقت تو یہ بھی ہے کہ میں خود اپنے سے بھی ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہتا۔ یعنی کبھی اپنی شکل آئینہ میں دیکھ کر اتنی تسکین ہوتی ہے کہ بس مُسکرا دیتا ہوں۔ کبھی اُسی آئینہ میں اپنے کو دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ ناک کو آخر کیوں یہیں ہونا تھا؟

ذرا اِدھر نہ اُدھر۔ آپ شاید اس کی وجہ معدہ کی کیفیت بتائیں۔
آپ کی سمجھ کی بات ہے اِس لئے میں اِس میں ترمیم کرنے والا کون
ہوا۔ خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ شادی ہوئی، شادی کے بعد نوکری ملی، اِس
لئے کہ اُس وقت ملتی تھی۔ شادی کے بعد چونکہ بچّے ہوتے ہیں اس لئے
بچے بھی ہوئے لیکن ۔ لیکن کا یہ مطلب نہیں کہ بچّے بُرے ہوئے ۔
سوال یہ ہے کہ اگر بچّے اچھّے بھی ہوتے تو کیا کر لیتے ۔ آخر میں نے ہی کیا
کر لیا جو یہ کچھ کر لیتے ۔ پھر میں ان کاہوں ہی کون جو انھیں اس طرح
تا یوں تولوں ۔ یہ پڑھیں گے لکھیں گے یا نہیں پڑھیں لکھیں گے ۔
بہر حال کسی نہ کسی حالت میں جئیں گے اور جئیں گے بھی تو اپنے
واسطے، جس طرح میں اپنے لئے جیتا ہوں ۔ دوسروں کے لئے یہ
جئیں بھی کیوں ؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ کچھ کر بھی سکیں گے۔ لیکن
اگر کر بھی لیئے تو کیا کر لیں گے ؟ جہاں تک کرنے کا سوال ہے، جیسے
کچھ میں نے کر لیا اور کچھ یہ کر لیں گے۔ اگر گھر کو آگ لگ نہ گئی گھر کے
چراغ سے تو بڑی بات ہو گی ۔

خیر چھوڑیئے اس بے مطلب کی بکواس کو۔ میں حال ہی کی اپنی
ایک آپ بیتی سُناؤں ۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار پڑھ چکنے کے بعد چارپائی پر سو چا کچھ

کام کر لوں۔ کچھ کیا بھی، لیکن زیادہ جی نہ لگا۔ اس لئے ارادہ کیا
کہیں گھوم آؤں۔ ٹہلتا ٹہلتا اپنے دوست مستری صاحب کے وہاں
پہنچ گیا۔ چونکہ اُن دنوں بی بی اُن کی میکے گئی ہوئی تھیں اس لئے
بے دھڑک اندر چلا گیا۔ آنگن میں اُن کا نوکر ملا۔ اُس سے معلوم ہوا
کہ مستری صاحب بھنڈارے میں ہیں۔ سُن کر کچھ تعجب ہوا لیکن چونکہ
اپنے دوست کی زندگی سے واقف تھا اس لئے سوچا چلوں دیکھوں
حضرت باورچی خانے میں آخر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ اندر گیا تو دیکھا
مستری صاحب غلّے کی بوریوں اور مٹکوں کے درمیان ایک کونے
میں بیٹھے کچھ مصروف سے ہیں۔ دیکھنے سے ایسے لگے جیسے آٹے کی کسی
بوری میں گھُسے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بدن پر سے آٹا جھاڑنے لگے
پوچھا۔ "کہو بھائی، خیریت تو ہے؟" بولے "کچھ نہیں، اتوار کا دن تھا
سوچا دیکھوں غلّہ وغیرہ کیا خرچ ہو گیا ہے کیا رہ گیا ہے۔" ایک
بوری پہ سیر ترازو رکھے تھے۔ انھیں نیچے رکھ کر اُسی بوری پر
میں بیٹھ گیا۔ چونکہ باہر سے آنے سے نگاہوں کی چکاچوندھ اب ختم
ہو چکی تھی اس لئے اندھیری کوٹھری کی چیزیں صاف صاف نظر
آنے لگیں۔ اُن کے ہاتھ میں اِنچ والی پٹری دیکھ کر پوچھا۔ "آخر
اِس سے کیا کر رہے ہو؟" "ڈالڈا کے دس پونڈ والے ٹن میں پٹری

ڈالتے ہوئے بولے "دیکھ رہا ہوں کڑوا تیل کتنا رہ گیا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ کڑوا تیل انچ والی پٹری سے ناپنے لگے۔ اور میری نظر کوٹھری کی دیوار پر لٹکی ہوئی چیزوں کی طرف گئی۔ چاروں طرف صرف تھیلیاں لٹک رہی تھیں کسی تھیلی پر ہلدی، کسی پہ مرچ، کسی پر نمک، تو کسی پر دھنیا غرض کہ ہر تھیلی پہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے تھیلی میں سے وہ چیز نکال لی جاتی ہے اور اُس کی قیمت جوڑ کر اُسی وقت تھیلی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اِس طرح جب تھیلی کی چیز ختم ہو جاتی ہے تو اُس وقت تک اُس چیز کی پوری قیمت اُس تھیلی میں اکٹھا ہو جاتی ہے — پھر اُسی قیمت سے وہ چیز اُسی مقدار میں بغیر کسی جھنجھٹ کے بازار سے منگوالی جاتی ہے۔

اِس انتظام اور اہتمام کو دیکھ کر میں تو بھونچکا رہ گیا اور اتنا پریشان ہوا کہ کچھ دیر بات چیت کر کے پھر اُلٹے پاؤں گھر ہی لوٹا۔ دن اِس طرح خراب ہوا تھا کہ اب کچھ نہ کرتے اور نہ سوچتے بنے۔ بار بار یہی خیال آئے کہ آخر اِس آدمی نے بھی زندگی کو کس حوصلہ اور اطمینان سے ناپ تول لیا ہے گز، فٹ، اِنچ اور روپیہ، آنہ، پائی سے۔ چنانچہ سارا دن زندگی اور اُس کی کامیابی اور ناکامیابی ہی کو

سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ آخر یہ دنیا بھی کیا تماشا ہے۔ اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے، کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہ ہونا چاہیئے۔ دن تھا دھن تیرس کا، یعنی دیوالی سے پہلے والی شام، جب ہندو برتن خریدتے ہیں اس خیال سے کہ اگر اُس دن برتن خرید لیں گے تو بقیہ سال گھر میں ایسی خوشحالی رہے گی کہ تین سو چونسٹھ دن برتن ہی خریدتے بیتیں گے۔ غرضکہ لکشمی اس طرح گھر میں آجائیں گی تو سال بھر گھر سے باہر نہ جا سکیں گی۔ حالانکہ میں نے کبھی اس طرح اپنے گھر میں لکشمی کا داخلہ نہیں کرایا تھا لیکن مستری صاحب کی زندگی کو تمام دن سوچتے سوچتے ایسا اثر پڑا کہ شام کو بازار جانے کے لیئے میں بھی تیار ہو گیا۔ جب بیوی سے برتن خریدنے کے لیئے روپیہ مانگا تو اُنھیں بھی تعجب ہوا۔ روپیہ لے کر گھر سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ مُنّے صاحب باہر کے دروازے سے کچھ گنگناتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ میں نے سوچا لکشمی کو لانے چلے تھے ہاتھ یہ لگے۔ اندر آکر گاندھی ٹوپی سر سے اُتار کر کُرسی پر اُنھوں نے ایک طرف پھینکی، شیروانی اُتار کر دوسری طرف۔ پھر میرے سامنے کھڑے ہو کر جیسے مجھے چڑھانے کے لیئے زور زور سے گانے لگے۔ ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

چونکہ بُو کافی آ رہی تھی اِس لئے میں نے سوچا، یار آج دوپہر ہی سے ایک آدھ 'پگ' جھاڑے ہوئے ہے۔ نوکر کو بُلا کر پھر انھوں نے پانچ روپے دئے اور تاکید کی "ادھا لانا"۔ چونکہ دھن تیرس کو برتن خریدنے کا حوصلہ اس طرح کرکرا ہوا تھا اِس لئے میں بھی بیٹھ گیا۔ لیکن اِس درمیان میں میری دن بھر کی اُلجھن ایک مستقل ذہنی تُرشی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے میں نے کچھ جھنجھلا کر پوچھا "کہو آج دن دھاڑے کسی کی جیب کاٹ لائے کیا؟" منّے صاحب بولے۔ "دوست تم نے بھی زندگی کو پہچانا نہیں"۔ پھر گانے لگے۔ ؎

زندگی مذاق ہے　　مذاق کو نبھائے جا

میں نے کہا "وہ تو ہے۔ لیکن میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تمھاری زندگی کیا ہے جو تم اس طرح لوگوں کے پیسے مارتے پھرتے ہو؟ کل آپ نے مستری بیچارے کا نام بتا کر اُس کے دوست کے دس روپیہ مار دیئے۔ مجھے کئی بار مصیبت میں ڈال ہی چکے ہو۔ آخر کب تک اِس طرح جیو گے؟ کب تک تم سوچتے ہو، تمھاری اِس 'ادبی' زندگی کا بوجھ تمھارے دوست اُٹھائے رہیں گے؟"۔ منّے صاحب بولے "یار، بیٹھنے بھی دو گے یا لکچر ہی جھاڑتے جاؤ گے۔ اگر

میرا آنا اچھا نہ لگا ہو تو کہو میں چلا ہی جاؤں ؟"۔
یہ کہہ کر وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہل ٹہل کر گانے لگا۔

کوئی چلا رہا ہے جیسے جا رہا ہوں میں

اِس طرح کچھ دیر گاتا رہا۔ میں کبھی چُپ رہا اور جب مُنّے ٹھنڈا پڑا تو میں نے کہا: "بھائی مُنّے، اگر کچھ دیر اپنی شاعری بند کر کے سُنو تو کہوں ؟" ایک دم جیسے اُچھل پڑا "کہو بھائی ضرور کہو، میں تو چاہتا ہوں کہ تم کچھ کہو۔ لیکن کہنے کے پہلے میری سُن لو۔ تم شاید یہی کہوگے نا کہ میں بھی تمھاری طرح شادی کیوں نہیں کر لیتا اور گھر کیوں نہیں بسا لیتا۔ پھر میری بیوی مجھے صبح شام ٹماٹر کھانے کو دے اور میں اِس وجہ سے ٹماٹر کھاؤں کہ ٹماٹر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اِس کے بعد تمھاری طرح دوسروں کو بے معنی لکچر پلاؤں، بے مطلب کتابیں لکھوں، پیسہ کماؤں اور اِس طرح، تمھاری رائے میں، زندگی کامیاب بناؤں ؟ لیکن یار میں اپنے کو اور دوسروں کو اِس طرح دھوکا دے کر جینا نہیں چاہتا۔ میں صرف جینا چاہتا ہوں۔ زندگی کو کامیاب بنانا نہیں چاہتا۔ زندگی مجھے بالکل ملیا میٹ ملی تھی اور اسے میں ملیا میٹ ہی چھوڑنا چاہتا ہوں۔ دوست، زندگی کامیاب

یا ناکامیاب نہیں ہوتی۔ زندگی صرف زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کو گز، فٹ، انچ سے نہیں ناپا جاتا۔ زندگی تھرما میٹر ہے۔ اسے ایک سو دو ڈگری بخار ناپ کر اتنا ہی افسوس یا خوشی ہوتی ہے جتنا ایک سو سات ڈگری بخار ناپ کر ہوتا ہے۔ یار، میری بات یاد رکھو۔ اگر تم نے بھول کر بھی زندگی کو کسی پیمانے سے ناپا تو زندگی کے ہاتھوں بُری طرح مات کھاؤ گے۔"

اس طرح معلوم نہیں مُنّے کب تک بکتا رہا اور میں سنتا یا نہ سنتا رہا۔ اتنا یاد ہے کہ نوکر اَدّھا لایا۔ مُنّے اَدّھا لے کر چلا گیا۔ میں نے اُسے جانے سے روکا بھی نہیں پھر اس طرح معلوم نہیں کب تک میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ باہر سے کسی نے پکارا۔ میں چونکا۔ جب تک اُس آدمی کو میں اندر آنے کو کہتا وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ گیروا بستر پہنے، داڑھی رکھائے، جھولی مالا لٹکائے، پنجابی آدمی کُرسی پہ میرے بغل میں بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا مہاتماجی ہاتھ دیکھتے ہیں۔ میرے دوست سنسری صاحب نے انھیں میرے یہاں بھیجا تھا۔ چنانچہ بغیر زیادہ سوچے سمجھے میں نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ مہاتماجی میری ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر بولے "بچہ

یہ لائف لائن ہے۔" میں نے کہا۔" جی۔" "اور یہ ہیڈ کی لائن ہے۔"
میں نے کہا۔" جی۔" "اور یہ ہارٹ لائن ہے۔" میں نے کہا۔" جی۔" "بیٹا
تیری سب لائنیں اچھی ہیں۔ تجھ کو بڑی اچھی نوکری ملے گی۔ شادی
بھی اچھی ہوگی۔ بچے جو ہوں گے بڑے بھاگمان ہوں گے۔ دولت
بہت آئے گی اور خرچ بھی ہوگی۔ اور تو ایک مکان بھی بنوائے گا۔
تیرے لڑکوں کی شادیاں اچھی ہوں گی۔" میں نے پوچھا۔" میرے
مرنے کا کوئی خطرہ تو نہیں ہے مہراج۔؟" باباجی چونکے، لیکن پھر
اپنے کو سنبھال کر بولے۔" نہیں بچہ، ایسی بات نہیں۔" اور پھر
وہ معلوم نہیں کیا کیا بکتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا یہی تو زندگی
ہے۔ اسی کو زندگی کہتے بھی ہیں۔ باباجی بھی اپنی زندگی کامیاب
بنا رہے تھے۔ میں نے اندر سے ایک روپیہ منگایا اور اسے بابا
جی کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ اس طرح میری ہتھیلی کی جان چھوٹی۔
باباجی اٹھ کر چلے گئے۔ میں منّے کی باتیں سوچتا رہا اور پریشان
ہوتا رہا۔ زندگی جو ہم سے لیتی ہے وہ دیتی بھی ہے۔ لیکن زندگی
کی شراب ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے نہیں بنتی۔ پیمانے اکثر
بدلتے رہتے ہیں۔ شراب کی لذت بھی بدلتی رہتی ہے۔ کبھی شراب
بھی بدل جاتی ہے اور کبھی ہم خود ہی بدلے رہتے ہیں لیکن اگر

زندگی کے ہاتھوں مات نہیں کھانا چاہتے ہو تو زندگی جو کچھ
تم سے لیتی ہے اُسے کھونا مت سمجھو اور زندگی سے جو تمھیں ملتا ہے
اُسے پانا مت سمجھو۔ اگر تم نے بھول کر بھی ایسا کیا تو زندگی کے
ہاتھوں برے بکو گے۔ یعنی ٹماٹر ضرور کھاؤ لیکن اس لیئے نہیں
کہ اُس سے تمھاری زندگی بڑھ جائے گی۔ بلکہ ٹماٹر اس لیئے
کھاؤ کہ اُس کا رنگ تمھیں پسند ہے۔ لیکن اگر تم ٹماٹر اُس
کے رنگ کی وجہ سے کھاؤ گے تو تمھاری بیوی تمھارے کھانے
کے لیئے صبح شام ٹماٹر نہیں لائے گی۔

شاید زندگی مجھے پرکھ رہی ہے۔ آج میں رُوئی دار بند گلے کا کوٹ اور
رُوئی دار تنگ مُہری کا پائجامہ اور رُوئی دار کنٹوپ کی دونوں گھنڈیوں کو
گلے کے نیچے کھینچ کر باندھتا ہوں تب بھی وہ دھماکا بار بار سُنائی پڑتا
ہے۔ اُس دھماکے سے ڈر لگتا ہے، میں سہم سہم جاتا ہوں۔ شاید یہ وہی
دھماکا ہے جو میری پیدائش کے وقت بندوق داغنے سے ہوا تھا۔
خوشی کے موقع پر بندوق کا جھوٹا فائر شاید اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ
اس دھماکے کو سُن کر میں زندگی میں پھر کسی اور آواز سے نہ ڈروں گا۔
لیکن آج اگر ڈر لگتا ہے تو اُسی دھماکے سے، یعنی اُسی جھوٹے فائر سے،
جو شاید میری زندگی ہے۔

———۰-۰-۰———

زندگی کے ایک بیس اور سات سال گزار کر بہاری ایک ایسی چیز کی تلاش میں آج نکلا تھا جسے پاکر اُس کی آتما پکار اُٹھتی، اب زندگی سے شکایت نہیں۔ چونکہ زندگی کے یہی ایک بیس اور سات اس کی جوانی کے دن بھی تھے، اس لئے بہاری یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اِس قسم کے تجربوں سے وہ ایسا کچھ انجان تھا۔ اِس کے برخلاف، اس سے پہلے جب جب اُس میں یوں ہی یا کسی چیز کی وجہ سے جذباتی بھوک کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے تب تب اُس نے اُسی یا کسی اور آگ سے کھیل کر اُن شعلوں کو بجھائے تھے۔ یوں جنسی پیاس بجھتی بھی کہاں ہے، کیونکہ اِس پیاس کو بجھانے کے لئے آدمی کو اُس سراب کا پیچھا کرنا پڑتا ہے جو شاید اُسے کبھی نہیں ملتا۔ مگر اکثر اُس سراب کا پیچھا کرنے میں ہی وہ پیاس

ھ جاتی ہے۔ ویسے پیاس مکمّل طور پر کبھی نہیں بجھتی۔ لیکن
دمی شاید تھک کر یا اپنی خواہش سے ہار مان کر ایسا محسوس
رنے لگتا ہے کہ جیسے پیاس ہی بجھ گئی۔
لیکن اتفاق سے آج اپنے کو ایسے شہر میں پاکر، جہاں
پہچانے جانے یا کسی کی آنکھوں کا پیچھا کئے جانے کا ڈر نہ
ہو سکتا تھا، بہاری کے اندر ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی،
جیسے وہ اندرونی یا باہری کسی بھی ڈر سے دبا نہ سکتا تھا۔ کبھی
کبھی مکمّل شخصی آزادی کا احساس ہی آدمی کو عجیب چیز بنا دیتی
ہے۔ چنانچہ آج جب بہاری نے اپنے کو اتنا آزاد پایا تو اِس
احساس ہی نے اُسے اُس آزادی سے فائدہ اُٹھانے پر مجبور
کردیا۔ اُس نے بھی سوچا۔ آج تک جب بھی کبھی ایسا موقع ملا اور
اس وقت اُس کی سمجھ میں ایسے موقعے زندگی میں بہت کم آئے
تھے!) تو اُس موقعہ اور اُس تجربہ کی ہمیشہ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی
تھی۔ یعنی یا تو کسی نے اُس کو پریم کرنے پر مجبور کیا یا کسی کی
خوبصورتی سے کھینچ کر اُس کو اُس مصیبت میں اپنے کو
ڈالنا پڑا تھا۔
لیکن آج ایسا موقع ہاتھ آیا تھا جب کہ خود کو ایک انجان

شہر میں پاکر وہ بغیر کسی ڈر یا سنکوچ کے، آزاد ہو کر، اپنے رومانی جذبہ کے لحاظ سے کوئی ایسی چیز پسند کر کے چُن سکتا تھا جو ہو بہو ویسی ہی ہوتی جیسی اُس کی آتما نہ جانے کب سے تلاش کرتی رہی تھی۔ یعنی عام طور سے جس جس سے اُس نے آج تک پریم کیا تھا اُن میں سے کسی کی آنکھیں اچھّی تھیں تو کسی کی شکل اچھی تھی۔ لیکن جس کا رنگ صاف تھا اُس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُس کا دل بھی صاف ہو۔ یا جس کے ہونٹھ اچھّے ہوں اُسکی ناک بھی خوبصورت ہو۔ یعنی جب جیسی ملی اُس کو ویسا اُس نے پریم کیا تھا۔ پریم کرنے کے لئے آخر وہ کسی کو گڑھ تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج جب اُس کی جیب میں پیسے تھے تو بہاری کا مَن، اپنے کو اُس خوبصورتی کے بازار میں پاکر، سوچ رہا تھا کہ آج تو وہ اپنے پسند کے لئے کسی کو گڑھ بھی سکتا ہے ایسی حالت میں بہاری آج اپنی جنسی آزادی کے اُڑتے ہوئے سپنوں کے پرکھیں سے باندھنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس بھرے بازار میں جس آزادی سے بہاری قدم اُٹھا کر چل رہا تھا اُس کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی پردیسی تھا۔ تنگ سڑک کے کنارے کنارے دو کانیں سجی ہوئی

ہیں، جن کی روشنی میں راستہ چلنے والوں کے دلوں کی تاریکی
بھی اُجاگر ہو جاتی تھی ۔ چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں چھوٹی چھوٹی
بکنے والی چیزیں بھری پڑی تھیں ۔خریدار بھی چھوٹے ہی
چھوٹے تھے ، یعنی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدتے اور آگے گزر
جاتے ۔ دو رویہ دوکانوں کے اوپر دو رویہ کوٹھے تھے ۔ کوٹھوں
کے چھجّوں پر کہیں سے کسی کی ناک کی کیل جھلک اُٹھتی تو کسی کی
ساڑی کے کنارے کا نقلی گوٹا آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا ۔
جتنی روشنی نیچے دوکانوں پر تھی اُتنی دوکانوں کے اوپر کوٹھوں
پر نہ تھی ۔ بلکہ کوٹھوں کی تاریک دنیا میں صرف اِتنی روشنی
تھی کہ ناک میں کیل اور گوٹے دار ساڑی پہننے والوں کی
شکلیں دکھائی دے سکتیں ۔ اور وہ شکلیں بھی دیکھنے والے
بس اتنی ہی دیکھ سکتے تھے کہ یہ طے کر سکیں کہ کس کو ۔ بھر
تاریک سیڑھی کو ٹٹولتے ہوئے وہ اوپر چڑھ جائیں ۔
اگر کوٹھوں پر چڑھ کر ناکوں کی کیلوں کے جڑاؤ نیھر اور
ساڑی کے گوٹے نقلی یعنی سراب ثابت ہوتے تو یہ اُس
مدھم سی روشنی کا قصور نہ تھا جو راستہ دکھا کر لوگوں کو اوپر
لے جاتی تھی ۔ بلکہ وہ تو اُس کوٹھے کی دنیا کا ہی قصور ٹھہرا

جو خود اکثر سراب ہوتی ہے۔
آخر اِس طرح بہاری کب تک ٹہلتا رہتا۔ لیکن انجان کسی کوٹھے پر چڑھ بھی کیسے جاتا۔ زیادہ یا کم ستارے تو دُور سے سب ہی چمکتے ہیں۔ بہر حال جب بہاری کچھ نہ طے کر سکا اور اِس طرح لگ بھگ تین سو گز کی پتلی سڑک، اِس طرف سے اُس طرف اور اُس طرف سے اِس طرف، ناپتے ناپتے وہ تھکنے لگا تو جیسے دماغ کو ٹیک دینے کے لئے وہ ایک پان کی دوکان پر ٹھہر کر پان خریدنے لگا۔ پان خرید رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اِتنے میں اوپر کوٹھے کی نیچی بلیسر پر سے جیسے کسی کی ریشمی ساڑی کا آنچل نیچے کی طرف جھپٹا۔ آنچل کے ساتھ بہاری کی نگاہیں کوٹھے پر کھینچ گئیں۔ ساڑی کا آنچل کندھے پر چُنتے ہوئے کوئی بلیسر پر سے مُسکرا رہا تھا۔
اِتنا اِشارہ پا کر کوئی کوٹھے پر کیوں نہ چڑھ جاتا۔ پہچاننے والوں کے واسطے آدمیوں کے ارادے اُن کے چہروں پر لکھے ہوتے ہیں پان والے نے جُھک کر ادب اور لحاظ سے پان دیتے ہوئے دوکان

کے داہنی طرف والی تاریک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"سیڑھی آگے ہے"

اب یہاں سوچنے سمجھنے کا موقع کہاں تھا۔ جو کچھ سوچنا سمجھنا تھا وہ تو بہاری گھر سے سوچ کر آیا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ آدمی سیڑھی طے کر پایا تھا اُس نے دیکھا دیاسلائی کی تیّی جلا کر اوپر سے کوئی اُس کا راستہ روشن کر رہا ہے۔ دیاسلائی کی روشنی سے تنگ اور اُوکھڑ کھابڑ سیڑھیوں کا راستہ بہاری کے لئے روشن بھی کیا ہوتا۔ لیکن دیاسلائی کی ایک تیّی جو کام کر سکتی تھی اُتنا اُس نے کیا۔ یعنی اُس روشنی سے راستہ دکھلانے والے کی کلائیوں سے لیکر مُنہ اور ناک کے نیچے تک کے حصّے ایک لمحہ کے لئے روشن ہو گئے۔ بہاری اپنی منزل اتنی نزدیک دیکھ کر کوٹھے پر کیا پہاڑ پر چڑھ جاتا۔ لیکن جب وہ سیڑھیوں سے گزر کر داہنی طرف کو مُڑا تو اُس نے اپنے کو ایک برآمدہ میں پایا جو بغل کے روشن کمرہ کی روشنی کا محتاج تھا۔ برآمدہ میں جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اُس کے سامنے جیسے ایک خوبصورت بُت پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ بہاری اُس چلتی ہوئی تصویر کا سامنا کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اگر اُسی وقت اُس کی

نظر اُس آدمی پر نہ پڑتی، جو بغل کے روشن کمرہ میں ایک کنارے بیٹھا تھا۔ کرسی پر آدمی کو اُس حالت میں دیکھ کر بہاری کے تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ کمرہ کے ایک کونے میں، جہاں روشنی نہیں کے برابر تھی، ایک کرسی پر ننگے بدن اپنے سارے کپڑے لتّے اپنی جانگھوں پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ کرسی کے بغل میں دیوار سے ٹھہری ہوئی ایک بید کی پتلی چھڑی رکھی تھی، جس کی مٹھیا چاندی جیسی چمک رہی تھی۔ بہاری نے جب آدمی کی گود میں پوری فوجی وردی کو گٹھری بنے دیکھا تو اُس نے سوچا سپاہی شاید کوئی پنجابی رنگروٹ ہے۔ لیکن اور آگے بڑھ کر اُسے اپنے اُس خیال کو کاٹنا پڑا، جب اُس نے دیکھا کہ ننگا سپاہی افسروں جیسی ٹوپی بھی سر پہ پہنے بیٹھا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پریشانی بہاری کو جس خیال سے ہو رہی تھی وہ یہ تھا کہ سپاہی جاندار تھا، یا بغیر جان کے اُس کرسی پر کاٹھ کے کھلونے کی طرح بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر اُس وقت جو دوسری تصویر بہاری کے دماغ میں آئی وہ ایک فوجی افسر کی تھی جو ہندوستان کی سرحد پر کہیں بیٹھا ملک کی بچاؤ کر رہا ہو۔

جس اندرونی دہشت اور ذہنی پس و پیش میں وہ اُس وقت پڑ گیا تھا وہ بہاری کو نہ وہاں سے آگے بڑھنے اور نہ پیچھے ہٹنے دیتے تھے۔ اُسی وقت اُس کی نظر جب اُس خوبصورت لڑکی کی طرف گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اُسے اُنگلی سے اشارہ کر کے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ بہاری ایسی جگہ آکر پھنسا تھا کہ اگر وہ اب اُس لڑکی کے اشاروں پر نہ چلتا تو کیا کرتا۔

چنانچہ اُس لڑکی کے ساتھ وہ بغل کے کمرہ میں داخل ہوا۔ لڑکی نے اُسے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور خود مُونج اور سرکنڈے کی نیچی پچیا پر بیٹھ گئی۔ کچھ لمحہ خاموش رہنے کے بعد لمبی لمبی گوری باہوں پر سے پھسلتی ہوئی سِلک کی ساڑی کو چُن کر کندھے پر ٹھیک کرتے ہوئے لڑکی نے پنجابی لہجے میں پوچھا "کتنی دیر رہئیے گا؟" بہاری جس اُلجھن میں پڑا تھا اُسے وہی جانتا تھا۔ چنانچہ اِس سوال کو سنتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اُس کا کھڑا ہونا تھا کہ اُسے بغل کے روشن کمرہ میں کھونٹی پر لٹکا ہوا وہ اوورکوٹ نظر آیا جس کے کندھے پر پیتل کا بنا ہوا بادشاہ سلامت کا تاج

چمک رہا تھا پنجابی لڑکی نے فوراً کہا "نہیں نہیں۔ بیٹھئے آپ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کتنی دیر رہیں گے آپ؟ رات بھر یا؟"

بہاری کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن اب اُس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے۔ بغل کے کمرہ میں ننگے سپاہی کا ڈر اُسے مارے ڈالتا تھا۔ حسین پنجابی لڑکی کا کاروباری سوال اُسے مویشیوں کا سوداگر بنائے دے رہا تھا۔ مکان کی خاموشی مکان کے ہر کونہ سے "قتل قتل" پکار رہی تھی۔ لیکن یہاں سے بھاگنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اِس لئے بہاری نے ہوش ہواس درست کر کے سمجھ سے کام لینا چاہا۔ "آپ کو میرے ساتھ باہر چلنا ہے۔" مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس سوال کا بھی کوئی اثر خوبصورت تندرست گوری چِٹی لڑکی پر نہ ہوا تو اُس نے سمجھا کہ صورت ضرورت سے زیادہ خراب ہے اور جس وقت وہ وہاں سے نکلنے کو سوچ رہا تھا تو سپاہی اپنا سارا سامان اور چھڑی لئے کھڑا ہوا اور کمرہ کے باہر نکلا۔ لڑکی نے موقع پا کر بہاری کے نزدیک ہو کر کہا "نہیں، میں یہاں سے باہر نہیں جا سکتی۔ اگر آپ چاہیں تو یہیں

تھوڑی دیر۔" پھر اُس نے باہر سپاہی کو جھانک کر دھیرے سے کہا۔" ابھی یہ ——" فوجی سپاہی کمرہ کے باہر تھوک کر اُسی وقت اندر لوٹا۔ اُس کے فوجی بوٹ جوتے کی کھٹ کھٹ آواز میں پنجابی لڑکی کی دھیمی آواز کھو گئی۔ کمرہ میں آکر سپاہی اپنے بید سے دروازہ پر مارنے لگا۔ بہاری نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔" اب بھی بھاگ چلو یہاں سے ورنہ خیریت نہیں۔"

جس وقت بہاری کرسی چھوڑ کر چلا، لڑکی نے آہستہ سے کہا۔" پھر کبھی آئیے گا، پانچ روپیہ۔" پورا جملہ بہاری نہ سُن سکا اور نہ لڑکی نے کہا۔ اُس وقت وہ سپاہی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سپاہی کیل دار بھاری بوٹ جوتے پہنے اپنی وردی وغیرہ گود میں سمیٹے بید جوتے پر چپٹ پھٹاتا ہوا کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ جس وقت تیزی سے بہاری سیڑھیوں پر اندھیرے میں پیر سنبھالتا ہوا اُتر رہا تھا تو وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر سپاہی اپنی وردی اور کپڑے اپنے ساتھ نہ لئے رہتا تو بھی سپاہی آخر سپاہی کیسے کہلاتا۔ لیکن بہاری کو دراصل تعجب تو اس بات پر ہوا کہ وہ جس احتیاط سے اپنی جان سمیٹے ہوئے

تھا سپاہی اُتنے ہی احتیاط سے اپنے فوجی کپڑے اپنی جان سے سمیٹے ہوئے تھا۔ بہاری جب نیچے اُتر کر، گلی سے باہر نکل کر، پھر سڑک پر چلنے لگا تھا اُس وقت وہ اِس نتیجہ پر پہونچا کہ وہ بھی ٹھیک ہی تھا۔ سپاہی اپنی جان کھو کر بھی سپاہی ہی رہتا، لیکن اپنی وردی کھو کر وہ کچھ بھی نہ رہ جاتا۔ اِس لئے تھکا ہوا سپاہی جس وقت کرسی پر بیٹھا تھا اُس وقت اُس کو جان سے پیاری اُس کی وردی تھی۔ لیکن جان کی سوچتے وقت بہاری کو جب اپنی جان کا خیال آیا تو اُسے اِس کا یقین نہ ہوا کہ وہ دراصل سیڑھیوں پر سے اُتر کر نیچے آیا تھا یا سیدھے کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔

کچھ آدمیوں میں یہ خوبی یا خرابی ہوتی ہے کہ وہ ایک بار گر کر بار بار گرنا اور اُٹھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بہاری اُن گلیوں اور سڑکوں پر ایسے ہی بھٹکتا اور پھرتا رہا، جیسے آدمی جب ایک بار جینے کو طے کر لیتا ہے تو اُس کے بھلے بُرے کو نہ سوچ کر دُکھ سُکھ سہتے ہوئے جیون کی پگڈنڈیوں پر پھرتا اور بھٹکتا رہتا ہے۔ آدمی اکثر یہ بھی تو نہیں جانتا

کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ وہ بُرا کر رہا ہے تو آسانی سے یہ نہیں طے کر سکتا کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو اور کیا کرے۔

راستہ چلتے وقت اگر ٹھیس لگ جائے تو آگے جانے کا ارادہ چھوڑ کر واپس کم ہی لوٹ آتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ جانتے ہوئے کہ اب وہ کیا کرے بہاری اُسی سڑک اور اُسکی داہنے بائیں روشنی اور بغیر روشنی کی گلیوں میں مارا پھرا۔ اُسی وقت چوراہے کے نزدیک اُسے کچھ بھیڑ دکھائی دی۔ جو تماشہ دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ بیکار ہی نہیں ہوتے۔ لیکن اگر بیکار تماشا نہ دیکھے تو کیا کرے۔ خالی دماغ دیر تک خالی بھی تو نہیں رہ سکتا۔ تماشے سب ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن تماشا دیکھنے والے سب ہی ہوتے ہیں کیونکہ دنیا کی اور چیزوں کی طرح آدمی کا دماغ بھی دیر تک خالی نہیں رہ سکتا۔

نزدیک پہونچ کر بہاری نے دیکھا کہ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ بیچ چوراہے پر ہو کیا رہا تھا وہ دور سے نہیں بتا سکتا تھا۔ چنانچہ اور نزدیک جا کر اپنی اونچائی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایڑی اُٹھا کر اُس نے بھی دیکھا اور حیرت سے دماغ چکر

کھا کر رہ گیا۔ چاروں طرف سے تماشہ دیکھنے والے ایک تنگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ بیچ چوراہے پر ایک میلے بدن کا لڑکا میلی لنگوٹی پہنے زمین پر اکڑوں بیٹھا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مہاجن کا جوان لڑکا ریشمی واسکوٹ میں گھڑی کی سونے کی چین لٹکائے چاندی کی مٹھیا کی ہلکی چھڑی ہوا میں گھماتا ہوا لڑکے سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ زمین پر سے چاندی کی چونی زبان سے جھک کر اٹھالے تو چونی اُس کی ہو جائے گی۔ لڑکا چونکہ لوگوں کی للکار میں آکر زبان سے چونی اُٹھانے کو تیار ہوگیا تھا اِس لئے مہاجن کے بیٹے نے دولت کی نمائش کرتے ہوئے اپنے منی بیگ میں سے ایک چاندی کی چونی نکال کر زمین پر پھینکی اور گھمنڈ سے مسکراتا ہوا اوپر کوٹھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب جو ہماری کی نظر بھی اوپر گئی تو تماشے کی صحیح وجہ اُس کی سمجھ میں آئی۔ نتھ پہنے گورے رنگ کی لڑکی نیچے مہاجن کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اِسی طرح دوسرے کوٹھوں پر سے لڑکیاں، نتھ یا بغیر نتھ کے، نیچے سڑک پر تماشہ دیتے ہوئے مہاجن کی دولت اور نتھ والی لڑکی پر رشک کر رہی تھیں۔ اِتنے میں زور سے تالی بجی اور معلوم ہوا کہ لڑکے کے منہ کی رال

نے لڑکے کی قسمت کی مدد کر دی اور اُس نے سڑک پر سے زبان
سے جوتی اُٹھالی۔ جس وقت مہاجن کا لڑکا کھسیایا ہوا دوسری
جوتی زمین پر پھینکنے کے لیے اپنا منی بیگ کھول رہا تھا،
بھاری کو اِس بُری طرح متلی آئی کہ وہاں سے پریشان ہو کر وہ
چلدیا۔ وہاں سے چلدیا اور چلتے چلتے اُسے حیرت ہو رہی تھی کوٹھے
کی تھ والی عورت کے اُس کمینے پن پر جو مہاجن کے لونڈے کو شہہ
دے کر اُس سے ایسا ذلیل کام کرا رہی تھی۔

چلتا جا رہا تھا اور پیسے کی جابر حکومت کو سوچتا جاتا
اور اُس پر پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ یک بیک سامنے
سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا جو جانا پہچانا سا معلوم ہوا۔
بھاری نہ اُسے ایک دم پہچان سکا اور نہ یہ طے کر سکا کہ
کس طرح بغل کی گلی میں کترا کر اُس آدمی سے جان بچائے۔
اور جب تک یہ طے کر سکتا کہ وہ کون ہے سعید نے سامنے
آکر اُس کا راستہ روک دیا ورنہ بھاری تو آنکھ بچا کر نکلا ہی
جا رہا تھا۔

اب جو مل گئے تھے تو اچھی طرح ملے۔ اور پھر ایسی جگہ
مل کر اگر اِس طرح نہ ملتے بھی تو کیا کرتے۔ بھاری نے پھر یہ

بھی سوچا کہ رات کے اُس وقت وہاں ہونا اُس کے لئے شاید اُتنا ہی معیوب ہو سکتا تھا جتنا سعید کے لئے۔ بہر حال سعید کو تعجب ضرور ہوا بہاری کو وہاں پاکر۔ لیکن ماں کا دودھ اُس نے آج ہی تو چھوڑا نہ تھا جو بہاری سے بقیہ پروگرام پوچھتا۔ چنانچہ سامنے کی دوکان پر دونوں چاء پیتے رہے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر جو دونوں اُٹھے تو سیدھے اُس گلی میں گئے جو مشہور تھی 'جدّن' کی گلی کے نام سے لیکن رہتی تھی جہاں اب رُوپ کنُور۔

پھر ویسی ہی گلی اور وہی تاریکی۔ ویسے ہی تنگ نیچی اونچی سیڑھی کے زینے۔ اور سیڑھی کے اندر اور سیڑھی کے اوپر وہی روشنی کی کمی۔ لیکن ہزار مصیبتیں سہی اوپر تو جانا ہی تھا کیونکہ کوٹھے کے اوپر روپ کنُور رہتی تھی، جو جدّن کی پوتی تھی۔ جدّن بائی کا جو زمانہ تھا اُس کے بارے میں کس نے نہ سُنا تھا۔ چار کی دوکان پر سعید نے بہاری کے کان کے پاس اپنا مُنہ لیجاکر بتایا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب جدّن کے وہاں نوابوں کا آنا جانا تھا۔ اُس کے بارے میں لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اُس کا بچپن نواب واجد علی شاہ کی ڈیوڑھی

کے اندر گزرا تھا، اِس لئے کہ اُس کی ماں نواب صاحب کی
خاص لونڈیوں میں سے تھی۔

تو جس جدّن بائی کی گدّی پر رُوپ کنور بیٹھی تھی وہ کوئی
ایسی ویسی تو کیا ہوتی۔ بہاری نے سعید کی باتوں سے یہی نتیجہ
بھی نکالا تھا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ شیرنی سے کوئی
گیدڑنی کو تھوڑے ہی دودھ پلایا ہوگا۔ اور جب سعید نے یہ
سب کہا تھا تو بہاری یقین بھی کیسے نہ کرتا۔ آخر سعید بھی تو
وہی کہتا ہوگا جو اُس نے دوسروں سے سُنا ہوگا۔ اور سعید
کوئی ایسا دوست تو تھا نہیں جو قصّے گڑھ کر سُناتا۔ پھر طوائفوں
کے بارے میں یہ بھی کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ کیا سچ اور کیا
جھوٹ ہے۔ لیکن بہاری کو سعید پر اعتبار تھا صرف بحیثیت
ایک دوست ہی کے نہیں بلکہ اُس سے زیادہ بطور ایک تجربہ
کار اور دنیا دیکھے اور دنیا سے کھیلے ہوئے نوجوان کے۔

چنانچہ کھلے ہوئے برآمدہ سے ہوکر سعید اور بہاری جس وقت
روشن کمرہ کے سامنے کھڑے ہوئے تو کمرہ میں ٹہلتی ہوئی بیس
بائیس سال کی خوبصورتی نے اُن کا استقبال کیا۔ آگے آگے
سعید تھا اور بہاری اب محض سعید کی پیروی کر رہا تھا چنانچہ

سعید کے پیچھے کھڑے بہاری نے سعید کے کندھے پر سے
ایک نظر کمرہ کی رانی کو دیکھا۔ دیکھا اور پھر یہ طے نہ کرسکا کہ وہ
عورت تھی یا کوئی جادو کی پتلی تھی۔ سعید بڑھ کر کمرہ میں چلا گیا
اور اندر جاکر اُس نے بہاری کو اندر بلایا۔ آداب اور تکلف کے
بعد دونوں دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ خود تخت پر چڑھ کر بیٹھی
اور پاندان گھسیٹ کر چھالیا کاٹنے لگی۔ بہاری جس پریشانی
سے مرا جا رہا وہ یہ تھی کہ سعید کی اُس سے جان پہچان ہوتے
ہوئے بھی دیکھ کر دونوں ایک دوسرے سے کچھ کھنچے کھنچے
سے ہیں۔ سعید چپ سگریٹ پیتا جا رہا تھا اور جیسے ساتھ ساتھ
اپنے جذبات پر قابو پانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر
چھالیا کاٹنے کے بعد اُس نے داہنی آنکھ کی اوپر کی پلک اُٹھاکر
شرارت سے ایک ترچھی نظر سعید کو جیسے تیر سے دیکھا اور پھر
دوسری ڈلی اُٹھاکر کاٹنے لگی۔ بہاری اُس کی کالی ساڑی پر
چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر اُس کا
دل اِس خیال سے جھلّا رہا تھا کہ اتنی دیر آئے ہوئے اور اُس
نے اُس کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ جس رُخ وہ بیٹھی تھی بہاری اُس
کا پورا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کنارے سے آنکھ، ناک،

ہونٹھوں اور ٹھوڑی کا بس ایک نقشہ جیسا اُس کی آنکھوں میں سمایا جاتا تھا۔

اتنے میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا اگالدان میں جُھک کر ڈالتے ہوئے سعید نے بہاری سے کہا "چلو بھائی، چلتے ہو ہیں تو چلدیا۔" اُسی وقت کالی ساڑی کی پری نے مُڑ کر بہاری کی طرف ایک اطمینان کی نظر سے دیکھا اور ہلکی مُسکراہٹ کے ساتھ اُس کے اوپر نگاہیں جمائے ہوئے پان کی سُرخی زبان سے اپنے ہونٹھوں پر آہستہ آہستہ پھیلانے لگی۔ بہاری جو کرسی چھوڑ کر اُٹھنا چاہتا تھا اُس کو جیسے وہیں کسی نے کاٹھ مار دیا ہو۔ اور اُس ایک لمحہ میں اُس کے اور بہاری کے درمیان خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ظرافت کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی کہ جیسے اُس کے بدن میں میٹھی میٹھی اُمیدوں کی لکیریں رینگ رینگ کر اُس کے اندر پھُریریاں پیدا کرنے لگیں۔ سعید نے کمرہ کے باہر پہونچ کر جو گھوم کر دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ دشمن نے اپنا ہی سپاہی چھوڑ لیا تھا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس بہاری کو بھی ہوا۔ چنانچہ شطرنج کی بساط پھیلی دیکھ کر اُس نے سوچا کہ پہلی چال وہی چل کر دیکھے۔

"آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے یار۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھو نا پھر چلیں گے۔"

"تم چاہو بیٹھو۔ میں ایسی جگہ بیٹھنے سے رہا"

"تو تم جاؤ نا۔ آخر تم سے کہتا کون ہے بیٹھنے کو؟ بڑے جو آئے ہو وہاں سے بنکے"

اب تو ہماری لال کے ہوش درست نہ رہے۔ اُس نے دیکھا یہ تو بات کا بتنگڑ ہو گیا۔ لیکن سعید کب اس چوٹ کو خاموش رہ کر برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے کمرہ میں لوٹتے ہوئے جیسے آگ ہی تو لگا دی "دیکھو جی، تمھاری جیسی لونڈیں ہم نے بہت دیکھی ہیں۔ میرے پاس جب تک پیسے ہیں دس ملیں گی تمھاری جیسی"

"واہ رے پیسے روپئے والے جو چلا ہے پیسے دکھانے۔ چل چل کہیں اور جا، جو تیری ہوا میں آئے۔ یہاں تمھارے جیسے جوتیاں پٹتے ہیں"

"آ پیٹ تو جوتیاں، دیکھوں میں ذرا" سعید کرسی پر بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چڑیل کہیں کی"

بہاری اپنی جگہ سے اُٹھ کر تخت اور سعید کے درمیان آگیا اور بیچ بچاؤ کرنے لگا۔ لیکن چونکہ فریقین نے شروع ہی میں بات حد تک پہونچا دی تھی، اس لئے بات زیادہ آگے بڑھنے سے جلد ہی رُک گئی۔ پھر دونوں خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ بہاری نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور دونوں کو سگریٹیں پیش کرنے لگا۔ جھگڑے کے ایک فریق نے تو اپنے زنانے ادب اور خلوص سے شکریہ ادا کر کے بہاری سے سگریٹ لے لیا۔ لیکن دوسرے فریق یعنی سعید نے اس بہانے سے معافی مانگ لی کہ وہ ابھی ابھی پی رہا تھا۔ خیر، بہاری نے بھی سوچا کہ کسی ایسی بات پر ابھی زور نہ دینا چاہیئے جو جھگڑے کی کسی طرح یاد تازہ کر دے۔ سعید چپ چاپ بیٹھا سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی بڑی تصویر کے برہنہ سر اور اُس میں پھنسے ہوئے بارہ سنگھے کی پریشانی اور بیچارگی کو رفیقانہ نظر سے دیکھتا رہا اور اپنے کو اُس دور دراز برفیلی دنیا میں پاکر معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ بہاری نے ٹوٹے پھوٹے جملے جو سُنے تھے اُن سے جھگڑے کی پوری صورت اور تصویر اپنے دماغ میں مکمل نہ کر کے حیرت کرتا رہا سعید کی

حماقت پر۔ آخر اُسے بھی کیا سنک سوجھی تھی جو بات اس حد تک بڑھادی۔ اگر بیچاری) خود کسی اور کے واسطے "ٹیک" ہوچکی تھی تو ایک ہی ساتھ دو جگہوں پر یعنی سعید کو بھی کیسے خوش کر سکتی۔ اور پھر دس روپیہ اور پانچ روپیہ میں کیا فرق ؟لیکن اس کا بھی کیا یقین ۔ اپنے اپنے پسند کی بات ہے۔کمرہ کے اندھیرے میں سعید کو آخر کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ دراصل وہ دس یا پانچ روپیہ لائق تھی۔

بہر حال اس طرح وہ سوچتا رہا اور من ہی من میں جتنا سوچتا اُتنا ہی سعید کو غلط پاتا۔ بیٹھے بیٹھے بار بار اُس کی نظریں تخت کی رانی سے ایک ہو جاتیں اور نگاہوں کے ایسے مختصر مِلن میں نوابوں کی ڈیوڑھی میں پلی جدّن کی پوتی حُسن اور عشق کے وہ خاموش پیغام بہاری کے کانوں میں سُنادیتی کہ اُس کی اُنگلیوں کی پوریں ٹوٹنے لگتیں۔ دھیرے دھیرے جب وہ اپنے اندر یہ طے کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے اِس طرح خالی ہاتھ نہ جائے گا تو سعید کے پیر یک بیک فرش پر حرکت میں آئے، جیسے اُس نے بہاری کے من کی بات سُن لی ہو۔ لیکن جب اُٹھ کر وہاں سے اُس نے چلنا چاہا تو طوالف نے

ابکی اپنی ہی طاقت کا استعمال کیا۔" ابھی کیسے جاؤ گے؟ میں
تو ایسے جانے نہیں دیتی۔ اب گانا سُنے بغیر نہیں جا سکتے۔"
اِس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ اُس کے مُنہ سے نکلے
اُس وقت اُس کی نگاہیں سعید کے بجائے بہاری کی نگاہوں
پر، کھونٹی پر سُنہرے ہار کی طرح، لٹک گئی تھیں۔ اور
اب جو بہاری کے دِل کے گرد اُس حسین چڑیل نے جمال
ڈال دیا تھا تو دِلوں کی شادی دیکھے بغیر سعید بھی ایسا کیا
بڑا ہٹ دھرمی تھا جو چلا جاتا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ کچھ
دیر گانا بجانا ہو گا۔ جس کے تن بدن کے انگ انگ کی
سنگیت سُن کر بہاری کا حال جب یوں ہی بے حال ہو رہا
تھا تو وہ اُس کا گانا کیوں نہ سُنتا۔ سعید کی دقت مختلف
تھی۔ لڑائی کے بعد وہ اکیلا وہاں سے نہیں نکلنا چاہتا
تھا۔ ویسے تو چائے کی دوکان ہی پر دونوں دوستوں کے
درمیان طے ہو گیا تھا کہ جب ساری بات چیت ہو جائے تو
سعید بہاری کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اور اُس تکرار کے
بعد ویسے تو ہر لمحہ سعید وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن
اندر ایک دل کا چور تھا جو اُسکے سارے غصّہ اور نفرت

کے طوفانوں کو میٹئے جاتا تھا اور اُس کے پیروں کو وہاں سے ہٹنے سے جیسے بیکار کر دیا تھا۔ سعید اُس تکرار اور شکست کے بعد بہاری کو وہاں چھوڑ کر اکیلے کھسیایا ہوا نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اُس کے پیٹھ پیچھے دونوں کیا باتیں کریں اور بہاری اُس چڑیل کے مت میں آکر اُس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔ اس کے برعکس، اگر بہاری کچھ چاہتا تھا تو صرف یہی کہ اب سعید کسی طرح وہاں سے چلا جائے۔ اور اُسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ جہاں سعید کو پہلے ہی چلا جانا چاہیئے تھا، وہاں وہ جوتیوں کی کھٹکار سُن کر بھی ٹس سے مس نہ ہو رہا تھا۔

بہر حال طے پایا کہ کچھ دیر گانا بجانا ہوگا۔ کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے سازندے گھر واپس جا چکے تھے۔ لیکن اگر عورت کسی کو خوش کرنے پر آجائے تو وہ کیا کیا نہیں کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُس پری زاد نے اپنی چپلیں پہنتے ہوئے کہا "ٹھہریئے، میں ابھی نیچے جاتی ہوں۔ اماں سے کہہ کر آتی ہوں۔ وہ روجن کو بلا دیں گی۔ جب سارنگی والا مل جائے گا تو بقیہ سب اکٹھا ہو جائیں گے" یہ کہتی ہوئی وہ جلدی جلدی

کمرہ کے باہر جلنے لگی۔ بہاری نے سوچا موقع اچھا ہے۔ اسی بہانے اُس کے ساتھ اکیلے ہوکر اُس سے کچھ دل کی باتیں کرلے گا۔ اس لئے یہ سوچتے ہوئے وہ بھی اُٹھا۔
"اندھیرے میں اکیلے آپ کیسے جائیں گی؟ رُکیئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں"
لیکن اُس تکلّف کا ردّعمل کچھ عجیب ہوا اور ایک لمحہ کے لئے اُس کے چہرہ پر پریشانی کی وہ لکیریں نظر آئیں کہ اُسے دیکھ کر بہاری کا دل جیسے بیٹھ گیا۔ اور چونکہ وہ کسی بھی قیمت پر اُس کی ناخوشی مول لینا نہیں چاہتا تھا اِس لئے مدن کی پوتی کی بے زبان پریشانی دیکھ کر وہ کُرسی پر سے چونکہ اُٹھ گیا تھا اس لئے بے تکلّفی کا اظہار کرتے ہوئے تخت پر جا بیٹھا۔ سیڑھی پر اُترتی ہوئی چپلوں کی آواز سے معلوم ہوا کہ سازندوں کو بُلانے کے لئے جو نیوں سی موسیقی کوٹھے کے نیچے تک پہونچ چکی تھی۔
"یار، تم نے بھی کمال کردیا۔ آخر بات بھی ایسی کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا"
"کچھ نہ کہو بھائی، سالی بڑی حرام زادی ہے۔ میں

جو جانتا کہ یہ کمبخت آج پھر یہاں ملے گی تو تمھیں ہرگز یہاں لانے کی حماقت نہ کرتا۔"

"کیوں یہی تو روپ کنور، جدن کی پوتی ہے؟"

"نہیں یار، تم بھی وہی ہو۔ کہاں روپ کنور اور کہاں یہ حرام زادی۔ یہ شاید کوئی اُس کی دُور کی رشتہ دار ہے۔ کسی چھوٹے شہر سے رُوپ کنور کے یہاں اُٹھنا بیٹھنا سیکھنے چلی آئی ہے۔"

"تم بھی کیا کمال۔"

"کیا؟ یعنی وہ آپ کی نظریں بڑی باسلیقہ اور شائستہ ہے۔ میاں ابھی ان گلیوں کی خاک کچھ دن چھانو تو معلوم ہوگا کہ ادھر کی طوائفیں کیا ہوتی ہیں۔ کوئی شریف عورت ہوتی تو تم کیا سوچتے ہو اس طرح بدزبانی کرتی۔ میاں یہاری تم کیا جانتے ہو؟ یہاں نوابوں کی اولادیں بستی ہیں۔ اپنی گردن کاٹ کر آپ کی نظر کر دیں گی، لیکن زبان پر لفظ شکایت نہ لائیں گی۔"

"یار بس اب شاعری نہ کرو۔ بتاؤ آخر بات

کیا تھی ؟"

"بات کیا تھی ؟ بات، بات کچھ بھی نہ تھی۔ اُس دن یہ سوچ کر آیا کہ رُوپ کنور ملے گی اور یہاں یہ کمبخت ملی۔ معلوم ہوا کہ رُوپ کنور کہیں باہر گئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چیف کورٹ کے سراج الدین صاحب کے ساتھ وہ اِن دنوں رہنے لگی ہے۔ کئی مہینے سے پہاڑوں پر پڑی ہے اُنھیں کے ساتھ۔"

بہاری حیرت کر رہا تھا اُس تقدیر پر اور سوچ رہا تھا اُس وکالت کو جو روپ کنور کے حسین اوقات کو اس طرح خریدے ہوئے تھی۔

"تمھارے کہنے کا کیا مطلب کہ روپ کنور کوئی اَور ہے اور یہ کوئی ؟"

جھنجھلا کر "یار تم نرے احمق ہی نکلے۔ جیسے عورت تم نے کبھی دیکھی نہیں۔۔۔ میں کوئی تم سے جھوٹ بول رہا ہوں ؟"

"نہیں، میں نے سوچا شاید مذاق کرتے ہو۔ اچھا بتاؤ ہوا کیا ؟"

نہایت ہی سنجیدہ ہو کر "ہماری یہ مذاق کی جگہ نہیں ہے۔
جو تمھاری طرح یہاں ہنسی اور مذاق کے خیال سے
آتے ہیں وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ اِس تاریک دنیا
کی یہی خصوصیت ہے کہ اپنے شکار کو پہچان کر یہ
اُس پر اسی تیزی اور صفائی سے چھاپہ مارتی ہے
جیسے شیر مچان کے پاس بندھے ہوئے بکرے پر"
"سعید، تم معلوم نہیں کیوں خواہ مخواہ آج عجیب
ذہنی کیفیت بنائے ہوئے ہو جس کی وجہ سے اِس
وقت سب تمھارے دشمن ہیں اور ہر چیز خطرہ کی
شکل اختیار کر کے تمھارے سامنے آرہی ہے۔
میں تم سے اُس رات کا واقعہ جاننا چاہتا ہوں
اور تم "

" اور تم معلوم نہیں کیوں اُس روز کا واقعہ جاننے
کے لئے مرے جا رہے ہو۔ اُس روز کا واقعہ
دراصل اگر سوچو تو کچھ بھی نہ تھا۔ میں یہاں اِس خیال
سے آیا کہ رُدپ سے ملاقات ہوگی۔ تم سے میں نے
بتایا کہ اُس کی میری تھوڑی ملاقات تھی۔ اگر اور

کچھ نہیں تو کم سے کم اتنی سلیقہ کی عورت ہے کہ اُس
کے پاس دس منٹ بیٹھ کر ہی طبیعت بدل جاتی ہے۔
لیکن میں نے بتایا نا کہ وہ باہر گئی تھی۔ مگر اب
جو آگیا تھا تو فوراً چلا بھی کیسے جاتا۔ پھر یہ بھی
میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی اُسی ذات کی پَود
ہے۔ اِس لئے آگیا تو اسی سے کچھ دیر بیٹھ
کر باتیں کروں۔ لیکن وہ باتیں کیا کرتی اِس
کو تو جب دیکھو تب اپنا پیشہ۔"

بہاری بیٹھا باتیں سُن رہا تھا اور اندر ہی اندر یہ
سوچ کر مُسکرا رہا تھا کہ سعید بہاری سے اِتنا بدظن ہو گیا ہے
کہ اُس کے ساتھ کسی حالت میں بھی انصاف کرنے کو تیار نہیں
ہے ورنہ جہاں تک اُس نے دیکھا تھا جب سے وہ آیا تب
سے اُس نے کم سے کم اُس سے تو کوئی روزگار کی بات نہیں
کی۔ لیکن سعید ایسے جذباتی کیفیت میں تھا کہ طوائف کے
کمرہ میں اپنے کو اِس طرح اکیلا پا کر وہ طوائفوں کے بارے
میں جو کچھ جانتا تھا جیسے سب کہہ ڈالنا چاہتا تھا۔
"خیر میں نے سوچا یہی سہی شکل صورت تو کمبخت

کی کوئی ایسی بُری تھی نہیں ہے"

بہاری اپنی تشخیص سعید کے بارے میں اس حد تک صحیح اُترتے دیکھ کر آدمی کی کمزوریوں کا اچھا خاصہ ماہر بنا ہوا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اُس پری زادی کا ذکر اُن الفاظ میں سُن کر آخر وہ اور کیا سوچتا۔

"بات دس روپیہ پر طے پائی۔ مجھے شبہ ضرور ہوا۔ مگر اُس وقت کیسے کچھ کہتا۔ لیکن جب کمرہ کھُلا اور روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور تھی۔ خیر میں اپنا غصّہ پی کر رہ گیا۔ اور اِس کی بدمعاشی دیکھیے کہ اُس کے بعد میرے سامنے آئی بھی نہیں۔"

بہاری کمرہ کے باہر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس خیال سے کہ وہ اب تک آئی نہیں، بس یوں ہی جیسے بات جاری رکھنے کے لئے شبہہ میں بولا "یہ تو عجیب بات بتا رہے ہو۔ شاید ـــ"

"شاید وایدکچھ نہیں۔ تم اصل میں اِنھیں ابھی جانتے نہیں۔ جب جان جاؤ گے تو میری باتوں کی قیمت سمجھو گے۔ مجھے اِن حرام زادیوں کا بڑا تجربہ ہے۔

انھیں خوب پہچانتا ہوں ہیں۔ لیکن یہ تو اِن کی خوش قسمتی ہے کہ عام طور سے اِن کا سابقہ تمھارے جیسے لوگوں سے پڑتا ہے۔ اور پھر یہ اِس خوشی اور اطمینان سے اپنے چاہنے والوں کو لوٹتی اور ننگا کرتی ہیں کہ پھر وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ ایسے ہی ایک بار اور اتفاق ہوا۔ میں یہیں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ معلوم ہوا کوئی بڑی حسینہ آئی ہیں۔ کالج کے ناتجربہ کار لڑکوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ لیکن روز یہی سُنوں کہ آج کسی کی سونے کی گھڑی ظالم نے رکھوا لیا ہے تو کوئی صاحب اپنی انگوٹھی دے آئے۔ فیس بھی صاحبزادی بہت اونچی رکھتے ہوئے تھیں لیکن فیس سے بھی زیادہ، اپنے عشق کے جادو کا جال بیچارے لڑکوں پر ڈال کر اُن کی جیبیں خالی کرا لیتی تھی۔ ایک بیچارہ تو ایسا اُس کے چکر میں آیا کہ کتابیں اور کپڑے وغیرہ سب بیچ کر انھیں دے آیا۔"

بہاری نے کمرہ کے چاروں طرف کسی قدر شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور اس تشویشناک خیال سے ذرا پریشان ہو کر کہ وہ

ابھی تک نہ آئی، تخت پر سے اُٹھا اور سعید کے بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا؟ یہی ہوا کہ یاروں سے طے ہوا کہ میں بھی ایک دن اُس جادوگرنی کے درشن کروں۔"

سعید کے منہ سے لفظ 'جادوگرنی'، سُن کر بہاری اندر ہی اندر ذرا سہما سا۔ لیکن اُس نے پھر اپنے کو سنبھالا۔ سعید کو جیسے جنون تھا۔ بغیر کچھ سوچے ہوئے دماغ کا بوجھ ہلکا کیے ڈال رہا تھا۔

"میں اُن کا سب سے بڑا بھگت بنا۔ ایسا کہ اُنھوں نے سودا بھی معمولی ڈھنگ ہی سے طے کیا۔ شاید خیال ہوا ہو کہ ایسے سے سودا کرنے سے کیا فائدہ جو خود ہی اپنے کو بنا بھاؤ کے بیچے ڈال رہا ہے۔ وہ تو صبح نیند کھُلنے پر معلوم ہوا تا کہ تکیہ کے نیچے نہ وہ پچاس روپیہ تھے اور نہ سونے کے گہنے۔"

"تو کیا تم صبح سے پہلے اپنے روپیے اور اُس کے گہنے سب لے بھاگے؟"

"لے بھاگے؟ بیگم کو نیند آئی نہ تھی کہ تکیہ کے نیچے

ہاتھ ڈال کر جو گہنے اُنھوں نے سونے سے پہلے اُتار کر رکھ دیئے تھے نکالا اور سب مال ٹال رومال میں اطمینان اور احتیاط سے میں نے باندھا اور پھر ایک دو تین کپ کا چمپت ہوا۔"

بابو بہاری لال اور گھبرائے ـــ" تو یہاں یہ سب بھی ہوتا ہے؟"

"یہ سب ؟ ارے یار یہاں یہی ہوتا ہے۔ ویسے یہاں کیا نہیں ہوتا ـ یہاں ڈاکہ پڑتا ہے، خون ہوتا ہے، قتل ہوتا ہے۔ کیا نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کوئی شریفوں کی دنیا تھوڑے ہی ہے۔ لُوٹنے اور گلا کاٹنے کے لیئے ہی یہاں یہ تخت پر فرش لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔ پان دان ان کی تجارت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ دو بیڑے پان کے احسان سے کس کے گلے میں پھندا یہ نہیں ڈال دیتی ہیں۔ دراصل پان میں کیا کیا ملا رہتا ہے یہ تو کم ہی پان کھانے والے جانتے ہیں۔"

بہاری نے بھی وہی پان کھایا تھا۔ دانتوں میں کچھ چھالیا

پھنسی رہ گئی نھیں اُگالدان میں تھوکنے لگا۔" بھائی اب چلو۔
اور زیادہ باتیں مت سُناؤ۔ میرا جی گھبرا رہا ہے۔"
ایک بار سعید بھی مُسکرایا۔" ابھی کیسے چلو گے؟ پھنسے ہو تو
اتنے سستے کیوں چھوٹو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ اب تک
سازندے ہی بُلا رہی ہے؟ کوئی تعجب نہیں اگر وہ بغل کے کمرہ
میں کسی اور کے ساتھ ہو اور پھر آکر یہاں اتنی دیر بیٹھنے کی
فیس بھی ہم لوگوں سے وصول کر سکتی ہے۔"
" نہیں بھائی اگر یہ سب نہ بھی ہو تب بھی یہاں سے
اب چل دینا چاہیے۔ آخر ہم لوگ کب تک اس طرح
یہاں بیٹھے رہیں گے۔"
بہاری اُٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی
تھی۔ کمرہ کی ہر چیز جیسے اُس کو ڈرانے لگی تھی۔
" بیٹھو، آخر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں تو جانتا
ہوں جہاں وہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھو وہ آتی ہوگی۔
نیچے جاتے وقت ہو نہ ہو اُسے کوئی زینہ پر مل گیا۔
پیسہ ہاتھ سے جانے دینے والی عورت نہیں ہے وہ۔"
بہاری ایک ٹک تخت پر سے نیچے لٹکتی ہوئی سفید چادر کے

کنارے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
سعید نے پوچھا "کیا دیکھ کیا رہے ہو؟"
بہاری چادر کے حاشیہ اور کونوں پر کڑھائی کا کام دیکھتے ہوئے بولا "یار اتنے عمدہ پھول کاڑھے ہیں اِس ظالم نے۔"
"اچھا تو تم ابھی یہاں کے پھولوں ہی کو دیکھ رہے ہو۔ یہاں کے کانٹے اور بھی دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ ہاں دیکھ لو غور سے۔ بی بی سے کہنا ایسے ہی پھول تمھاری چادروں میں وہ بنا دیں گی۔"
بہاری زمین پر بیٹھا چادر اُلٹ کر اُس کے کونے کی نقاشی دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک دم چونکا۔ سعید بھی چونکنا ہوا۔ اب جو دونوں کی نظریں تخت کے نیچے گئیں تو آدمی کا دھڑ دو حصّوں میں نظر آیا۔ بہاری جو پیچھے ہٹنا چاہا تو پچھاڑ کھا کر فرش پر گرا۔ سعید نے آگے بڑھ کر نیچے لٹکتی ہوئی چادر ایک دم اوپر کو اُلٹ دی۔ اوپری دھڑ کی پتھرائی ہوئی آنکھیں سعید کو دیکھ رہی تھیں۔ لاش خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ سعید نے گھوم کر آنکھیں پھاڑ کر جو بہاری کو دیکھا تو اُس کا چہرہ چادر کی طرح سفید نظر آیا۔ جس وقت وہ بہاری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے

ایک کنارے کر رہا تھا اُس نے دیکھا کہ وہ چلّانے کی کوشش
کر رہا ہے، لیکن آواز گلے سے نکل نہیں پا رہی ہے۔ اُس نے
بہاری کے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھتے ہوئے اُس سے اشارہ کیا
اپنے پیچھے پیچھے چلنے کو۔ باہر جاتے جاتے سعید نے تخت پر مُڑی
ہوئی چادر نیچے گرا دی۔ برآمدہ میں جا کر اُس نے اُنگلی سے اشارہ
کر کے بہاری کو وہیں کھڑے رہنے کی تاکید کی اور خود سیڑھی
کی طرف بڑھا۔ لیکن وہاں اُس طرح اکیلے کھڑے رہنا
بہاری کے بس کی بات نہ تھی۔ اِس لئے آہستہ آہستہ وہ بھی سعید
کے پیچھے پیچھے چلا۔ سعید کو اس کا پیچھا کرنا اچھا نہ لگا لیکن بہاری کو سمجھانے
یا ڈھارس بندھانے کا وقت کہاں تھا۔ بہاری بھی زیادہ
سوچ سمجھ کیا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سوال اُس وقت صرف
جینے کا تھا اس لئے اُس کے اندر سے جیسے کسی نے
آواز دی ــــ "سعید تمھیں چھوڑ کر چلا نہ جائے"

سعید نے نیچے جا کر جو چھوٹے دروازہ کو دھکّا دیا تو معلوم
ہوا کہ باہر سے دروازہ بند تھا۔ دماغ چونکہ بڑی تیزی سے کام کر رہا
تھا اِس لئے باتیں دھیرے دھیرے سمجھ میں آ رہی تھیں
چنانچہ جب وہ بہاری کا ہاتھ پکڑے اوپر آیا تو پوری صورت

اُس کی سمجھ میں آئی۔ اپنے ہونٹھوں پر اُنگلی رکھ کر اُس نے آہستہ سے بہاری سے کہا۔ "جان کا سوال ہے۔ میرے پیچھے آؤ۔ جو کرتا ہوں وہ کرو۔" بہاری اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن جب سعید پھر اُسی کمرہ میں داخل ہونے لگا، جس میں آدمی کے دو ٹکڑے رکھے ہوئے تھے، تو اُس کے قدم آگے نہ بڑھیں لیکن فوراً اُس کو سعید کا جملہ یاد آیا "جان کا سوال ہے۔" چنانچہ وہ سعید کے ساتھ ساتھ کمرہ پار کر گیا۔ جس وقت وہ غسلخانہ میں ہوکر گزر رہا تھا اُس کے سر سے کوئی چیز چھو گئی۔ اُس نے جو چونک کر دیکھا تو کھونٹی پر کسی عورت کے سر کے نقلی بال لٹک رہے تھے۔ وہ جھپٹ کر بہاری کی بغل میں ہو لیا۔ سعید پیچھے کوٹھے کے بلیسر کے پاس پہونچ کر دوسرے کوٹھے پر چھلانگ مارنے کے لئے گلی کے فاصلہ کا اندازہ کر رہا تھا۔ بہاری نے جو نیچے جھانک کر دیکھا تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ سعید بلیسر پر چڑھ کر بہاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ جب اُس نے دیکھا کہ بہاری بالکل بے دم ہو رہا ہے تو اُس نے اپنا جملہ پھر دوہرایا "بہاری، جان کا سوال ہے۔" اور جب تک بہاری بلیسر کے اوپر چڑھتا سعید گلی پھاند کر

دوسرے کوٹھے پر پہونچ چکا تھا۔ دوسرے کوٹھے کی چھت پر
پہونچنا بہاری کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن سعید کے اُس طرف
نکل جانے کے بعد جو اُس نے اپنے کو وہاں اکیلا محسوس کیا
تو وہ بھی جان پر کھیل گیا۔ سعید اب دھیرے دھیرے دوسرے
مکان کی چھت کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر سے گندے پانی
کا جو پائپ نیچے جا رہا تھا اُسے دیکھ کر اُس نے سوچا کہ اُس کے
سہارے نیچے اُتر جائے۔ لیکن اُسی وقت گلی میں حرکت ہوئی۔
اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پگڑی باندھے کھڑا ہے چنانچہ
وہ بہاری کا ہاتھ پکڑے مکان کی تیسری منزل پر چڑھ گیا۔
اوپر پہونچکر اُس نے دیکھا کہ اُس مکان سے بغل والا مکان
بالکل مِلا ہوا ہے۔ دقت صرف یہ تھی کہ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے
جڑے ہوئے تھے۔ اُس نے جیب سے رُومال نکالا اور اُسے
ہاتھ میں لپیٹ کر بغل والے مکان کی چھت کی تیز لوہے کی
سلاخ ہاتھ سے پکڑ لی اور پھر شیشوں کے ٹکڑوں پر جوتے
رکھ کر تیسرے مکان کی چھت پر پہونچا۔ اُس مکان کی چھت
پر پہونچ کر اُس نے آہستہ سے بہاری کے کان میں کہا۔
"اب ہمّت سے کام لو" بہاری نے سوچا موت یہیں کہیں

ہے۔سعید آہستہ آہستہ زینہ سے دوسری چھت پر آیا۔
کوئی ٹین کی چھت کے نیچے سو رہا تھا۔سعید سونے والے کے
بالکل بغل سے نکلا۔بائیں طرف ایک اور زینہ نظر آیا۔
اُس سے نیچے اُتر گیا۔سیڑھی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں
دروازہ بند تھا۔دروازہ کو ٹٹول کر سعید نے معلوم کیا کہ
تالا نہیں بلکہ چٹخنی ہے۔لیکن جو چٹخنی کھولی تو آگے گلی ملی۔
ایک منٹ کے لئے ٹھہرا رہا۔پھر اندازہ لے کر باہر نکل پڑا۔
جس وقت دونوں گلی میں تیز قدم چل رہے تھے بھاری
نے ذرا آگے جا کر بھاگنا چاہا۔سعید نے اُس کا کندھا پکڑ
کر پیچھے کھینچ لیا۔بھاری سعید کو کوستا ہوا جتنا تیز قدم سعید
اُس کو چلنے دیتا تھا چلتا رہا۔اور لگاتار یہی سوچتا رہا کہ
اِس کمبخت نے کہاں لا کر پھنسایا۔لیکن اُس وقت تو جان
کا سوال تھا۔اِس لئے اُس کے پانے کا افسوس نہ رہا
جس کی تلاش میں آج سرِ شام ہی چوک کی تنگ سڑک
پر وہ آ نکلا تھا۔

میرا پہلا براڈکاسٹ

بہت دن نہیں ہوئے، ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔یونیورسٹی میں کچھ دنوں ملازمت کرکے اُن دنوں قریب قریب بیکار ہی تھا۔کسی اور حالت میں وہ نہایت ہی مایوس کن بات ہوتی۔ لیکن صرف اُس سن اور اُس کی بخشی ہوئی ذہنی صحت ہی کا تقاضا تھا جو میں نے ہمت اور اُمید کی لگام ہاتھ سے بالکل نہیں چھوڑ دی۔بجائے کسی جان مار مایوسی اور بے صبری کے طبیعت کی وہ کیفیت تھی کہ موافق یا غیر موافق ہوا کے چلنے سے تنکے کی ہر حرکت کو اپنے لئے کسی نہ کسی خوشی کا پیامبر سمجھتا تھا۔

بہر حال ایک دن ایسے ہی بیٹھے بٹھائے دیکھتا کیا ہوں کہ ڈاکئے نے ایک لمبا لفافہ لاکر میرے 'لیٹر بکس' میں ڈال دیا۔ لفافہ جب نکالا تو دیکھا کہ اُس پر 'آن ہز مجسٹیز سروس' لکھا

ہوا ہے۔ اس سے پہلے چونکہ اس قسم کا لفافہ پانے کا کم ہی اتفاق ہوا تھا اس لئے خط کو دیکھتے ہی جیسے آنکھوں میں اُمید کے آنسو بھر آئے۔ لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی ایک دوسری عبارت پر نظر پڑی "آل انڈیا ریڈیو" پھر کیا تھا دل بلّیوں اُچھلا۔ آپ شاید اسے دماغ کا فتور کہیں۔ لیکن اُس وقت جب بھی میں ملازمت کی سوچتا تھا تو یونیورسٹی کے علاوہ، دو ہی اور معقول جگہوں کا خیال آتا تھا، یعنی دلّی سرکار کی نوکری یا "آل انڈیا ریڈیو" کی ملازمت۔ ایسی حالت میں لفافہ پر آل انڈیا ریڈیو لکھا دیکھ کر دل پر کیا گزری ہوگی، آپ خود ہی سوچئے۔

ریڈیو کے اُس لفافہ کو میں نے نوکری کا خط سمجھا۔ میری خوشی اور پریشانی کا اندازہ آپ لگائیے۔ لیکن تجربہ کی بنا پر اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا یا اپنی قسمت سے اِس قسم کی اُمیدیں رکھنا اور بالو پر دیوار بنانا ایک ہی ہوا۔ لفافہ پھاڑتے پھاڑتے جیسے دل پھٹ گیا۔ خط کے مضمون سے معلوم ہوا کہ ۱۸ فروری کو لکھنؤ ریڈیو سے تقریر "براڈ کاسٹ" کرنا ہے سلے دے کے ۳۵ روپیہ۔ جی ہاں کُل ۳۵ روپیہ، کیونکہ اُس وقت ایک تقریر کے لئے ریڈیو سے ۳۵ روپیہ کا صرف ایک چیک یعنی

روپیہ نہیں بلکہ روپیہ ملنے کا کاغذی وعدہ ملتا تھا۔ اسے لڑائی کی مہنگائی یا میری خوش قسمتی کہیئے جو آج ۵۰ روپیہ کے عیوض اپنی ۳۵ روپیہ کی ریڈیائی کامیابی کی کہانی آپ کو سُنا رہا ہوں۔

لیکن جب سنبھل کر سوچا تو اس نتیجہ پر پہونچا کہ بُرا کیا ہے۔ اپنے کو سمجھایا بھئی روپیوں کی مت سوچو۔ کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں نقد کی بات کم اور عزّت اور رُتبہ وغیرہ کی صورتیں زیادہ سوچی جاتی ہیں۔ ویسے ریڈیو پر بولنے کا حوصلہ بھی بہت پُرانا تھا۔ لیکن اور حوصلوں کے ساتھ وہ بھی اِس مایوس کُن زندگی میں پورا ہوتا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام بنانے والے ایک صاحب ایک بار اس طرف آئے بھی لیکن یونیورسٹی کے اور لوگوں کے ساتھ میری بھی "قیمتی" رائے لے کر چلے گئے۔ روپیہ سوا روپیہ اُن کی خاطر تواضع میں صرف ہو گئے۔ ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اِس لئے سوچا، موقع اچھا ہے۔ اسی بہانے سرکاری خرچے پر لکھنؤ بھی ہو آئیں گے۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ وہاں بھی بڑے بڑے دفتر کُھل رہے ہیں۔ اقتصادیات والوں کی اِن دنوں ہر جگہ

کھپت کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کون جانے کہاں اور کب کام بن جائے۔ ایک ہی ڈھیلے میں دو بیر۔ اور اگر کچھ نہ ہوا تو یہ کیا کم کہ آواز فضا میں کیلاش پربت سے لے کر راس کماری تک لہرائے گی۔ الفاظ ستاروں کے مُنہ چومیں گے سب جملے کہکشاں سے ہو کر گزر جائیں گے۔

اس طرح اپنی اُمنگوں کا بوجھ لئے اُٹھا۔ خط اُٹھا کر پھر سے دیکھا۔ دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر سے براڈ کاسٹ کی تاریخ ملائی۔ پھر سُرخ موٹی پنسل لے کر کیلنڈر پر ۱۸ تاریخ کو ایک سُرخ گولائی میں گھیر دیا۔ خط لئے ہوئے اندر گیا۔ میاں کی باچھیں کھلی دیکھ کر بیوی بھی مسکرائیں۔ سمجھیں ہو نہ ہو کوئی خوشخبری ہے۔ لیکن اس ڈر سے کہ وہ کچھ زیادہ نہ سمجھ لیں میں نے فوراً بتا دیا "ریڈیو پر بولنے جانا ہے"۔ بچے ایک دم چلا اُٹھے "بابو ریڈیو پر بولیں گے، بابو ریڈیو پر بولیں گے"۔ آفت مچ گئی۔ بی بی کو دیکھا، بیچاری کچھ پریشان سی ہیں۔ اس ہنگامہ میں پوری بات اُن کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ شاید اِس خیال سے پریشان تھیں کہ ریڈیو پر تو گانا بجانا ہوتا ہے۔ اِس لئے میں نے انھیں سمجھایا "اُس دن

ہٹلر کو بولتے سُنا تھا نا؟ ہاں، بس وہی۔"

یہ مرحلہ طے ہوا تو اب دوسرے مرحلے پیدا ہوئے۔ سوچنے لگا کہ اِس احسانِ ناگہانی کے لئے کون ذمّہ دار ہو سکتا ہے۔ نیکی کرنا اور اس طرح چھپ چھپ کے۔ دل جیسے بھر آیا۔ بے تحاشا کرشن چندر صاحب کا خیال آیا۔ چونکہ اُردو کے بہت بڑے ادیب مانے جاتے تھے اِس لئے ایک آدھ قصّہ کہانی لکھنے کے ناتے ایک بار اُن سے بھی خط کتابت کر بیٹھا تھا۔ وہ اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ہی ملازم تھے۔ میں نے سوچا، ہو نہ ہو میرا آرٹ، اُنھیں بھی پسند آیا۔ اِس لئے شاید میری عزّت افزائی کی اُنھوں نے یہ صورت نکالی ہے۔ احسان مندی کے جذبات کے اظہار کی غرض سے فوراً ایک خط اُنھیں اُسی وقت ٹائپ کر کے ڈال دیا اور خط کے آخر میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ جب لکھنؤ آؤں گا تو آپ ہی کے وہاں قیام کروں گا۔

خط کے جواب کے انتظار کی کہاں فرصت تھی۔ سوچا، خط پہونچ ہی گیا ہوگا، جواب آئے نہ آئے۔ اصل میں اُس دماغی جلد بازی میں اِس قسم کے نازک اور "رقیق" پہلوؤں کی طرف خیال بھی کیسے جاتا۔ یہ تو براڈکاسٹ کا بھوت سر سے اُترنے

کے بعد ہی معلوم ہوا کہ بیچارے مصروف کرشن چندر کو اُس براڈ کاسٹ کے دعوت نامہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یعنی وہ ایک دوسرے ہی صاحب کی مہربانی تھی۔ ایسی حالت میں کرشن چندر صاحب میرا خط پاکر شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اور پھر خط میں دھمکی جو تھی، یعنی لکھنؤ پہونچ کر اُنھیں کے وہاں ٹھہرنے کا اصرار تھا۔ ایسی حالت میں خط کا جواب کون دیتا اور اپنے سر بے مانگی مصیبت مول لیتا۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میرے اوپر تو اور ہی سرگرمیاں حاوی تھیں یعنی کس گاڑی سے جاؤں، کس درجہ میں سفر کروں، کیا کیا کپڑے ساتھ لے جاؤں، لکھنؤ میں کتنے دن ٹھہروں، وغیرہ وغیرہ۔ بات کُل ۳۵ روپئے کی تھی۔ اس لئے یہ خیال مستقل دماغ پر چھایا رہا کہ لوٹتے وقت ضرور کچھ بچ کر آنا چاہئے کیونکہ ایک طرح سے وہ میری پہلی "ادبی کمائی" تھی خیر صاحب! ایک ایک کر کے سب منزلیں طے ہوئیں اور میں کسی طرح جان لے کر رات کے ساڑھے نو بجے انٹر کلاس کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گیا۔

ویسے تو گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مسودہ لکھ چکنے کے

بعد اُسے کئی بار دوہرا ڈالا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ مسودہ کا اچھا خاصا حصّہ اب حفظ ہو چلا تھا۔ کبھی گھڑی سامنے رکھ کر، کبھی کسی دوست کو بٹھا کر، غرضکہ ہر حالت میں اور ہر صورت سے مسودہ کا مطالعہ کر کے اُسے پندرہ منٹ کے وقت کی پابندی کے لحاظ سے پکّا کر لیا تھا۔ اگر آپ پوچھیں کہ آخر وہ کون سا ایسا اہم مسئلہ تھا جس پر اِس بُری طرح عقل اور غور و فکر کا صرف ہوا اور اِتنی خواہ مخواہ کی پریشانی اُٹھانی پڑی، تو صاحب اب مضمون کا عنوان تو یاد نہیں رہا۔ لیکن اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ کسی سلسلہ میں لڑائی کے بعد پیدا ہونے والی دنیا کی جیسے ایک مجسّم تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی میں نے۔ خیر چھوڑیے اِن باتوں کو۔ اصل میں ریڈیو کے واسطے مضمون لکھنا بقیہ دیگر لوازمات اور جھنجھٹوں کے مقابلہ میں سب سے آسان کام ہوتا ہے۔ حقیقتاً اِس سلسلہ میں جو دو سب سے بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں، اُن میں سے ایک ہے لکھنؤ تک سفر کرنا اور دوسری ہے ٹھیک پندرہ منٹ میں، بغیر کھانسے ہوئے، پوری تقریر پڑھ کر سُنا دینا۔ پہلی دقّت کا ذکر کر چکا ہوں۔ دوسری پریشانی کا دَورہ ٹرین کے سَفر ہی میں شروع ہو گیا۔

تقریر کی ایک نقل پہلے ہی بذریعہ ڈاک لکھنؤ بھیج چکا تھا۔ احتیاطاً دوسری نقل جیب میں رکھ لی تھی۔ چنانچہ ٹرین میں جب تک نیند نہیں آگئی تب تک اُسے بار بار پڑھتا رہا۔ پھر بھی دماغ میں مسلسل یہ خلش رہی کہ کس طرح ٹھیک پندرہ منٹ ہی پر یعنی نہ ایک سیکنڈ پہلے نہ ایک سیکنڈ بعد، تقریر ختم ہو جائے گی۔ ساتھ ساتھ جو دوسرا احساس مارے ڈالتا تھا وہ یہ تھا کہ معلوم نہیں ملک کے کونے کونے میں کون کون ہستیاں میری تقریر سُنتی ہوں اور پتہ نہیں کیا رائے قائم کریں۔ کبھی گاندھی جی کا اور دیش کے دوسرے نیتاؤں کا خیال آئے تو کبھی لاٹ صاحب وغیرہ کا خیال ستائے ـــ دوستوں دشمنوں کو بھی سوچا۔ غرضکہ دماغی کیفیت ایسی تھی کہ بس سارے ملک کو اپنا براڈ کاسٹ ہی سُنتا محسوس کرتا رہا اور اُس خیال سے اسی طرح پریشان ہوتا رہا۔

لیکن اس ڈرامہ کا قیامت خیز منظر اُس وقت شروع ہوا جب میں لکھنؤ اسٹیشن سے تانگے پر سوار ہو کر ریڈیو ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ ویسے لکھنؤ اُس سے پہلے بھی آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن آج لکھنؤ میں داخل ہوتے وقت عجیب تجربہ ہوا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے سڑکوں پر چلنے والے مجھے دیکھتے ہی پہچان

جاتے ہیں اور اُن کی پُر معنی نگاہیں کہتی ہیں " آپ ہی ریڈیو پر آج تقریر کریں گے ؟" جوں جوں تانگہ شہر کے اندر چلتا گیا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک اسٹیج ایسا بھی آیا جب میں نے محسوس کیا جیسے سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے بھی مجھے پُر معنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی بنی ہوئی مخصوص صراحیوں نے بھی جو ایک ٹھیلے پر لدی جا رہی تھیں، مُنہ کھول کر میرا استقبال کیا۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ میری باتوں پر شاید یقین نہ لا کر ہنسیں۔ لیکن یہ باتیں دراصل اِس طرح ہنسنے سے نہیں بلکہ ریڈیو پر پہلی بار براڈکاسٹ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں!

تانگہ ریڈیو ہاؤس کے سامنے ہی پہونچ کر رُکا۔ کرشن چندر صاحب کی خط کا جواب نہ دینے کی ترکیب رد ہو گئی۔ اندر میرا پیغام پاکر اُنھیں باہر نکل کر میرا استقبال کرنا پڑا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں ضروریات سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کرنیکے بعد میں ریڈیو ہاؤس واپس آیا۔ خود بھی جی چاہتا، کرشن چندر صاحب نے بھی براڈ کاسٹ کرنیکے کمروں کو اندر سے دیکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ جو دو چیزیں کثرت سے نظر آئیں وہ تھیں

رنگ برنگ کی عورتیں اور قسم قسم کے تار۔ میں سوچنے لگا، اپنی ناسمجھی میں مَیں ریڈیو کو بے تار کا تار سمجھے بیٹھا تھا لیکن یہاں سے زیادہ تار شاید ہی کہیں اور نظر آئے تھے۔ عورتوں کو دیکھ کر اِس نتیجہ پر پہونچا کہ ریڈیو وہ دنیا ہے جہاں مردوں سے زیادہ عورتیں ہوتی ہیں۔

ایک کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ جھوم جھوم کر اور آگے قدم بڑھا بڑھا کر 'مائک' کے اندر کچھ کہہ رہے تھے، جیسے دیہاتی عورتیں لڑتے وقت ایک دوسرے کو جھپٹ جھپٹ کر گالیاں دیتی ہیں۔ کمرہ میں طرح طرح کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو آدمی مٹّی کے بڑے ناند اور کونڈے "تھپ تھپ تھپ تھپ" پیٹ رہے تھے۔ میرے دوست نے مجھ سے بتایا، دیہاتی پروگرام 'براڈ کاسٹ' ہو رہا ہے۔ میں نے کہا "لیکن یہ لوگ تو پڑھے لکھے لگتے ہیں؟" پھر اُن سے معلوم ہوا کہ دیہاتی زبان میں اس کام کو بھی شہری لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔ بہرحال کمرہ کے اندر جس قسم کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں اُن کی وجہ سے پورا کمرہ جیسے ہندوستان کا نقشہ لگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کاش اس کمرہ کے دروازہ پر "ہمارا ہندوستان" لکھا ہوتا۔ ایک دوسرے

کمرہ میں اچھی بھلی عورتیں رو دھو کر کہرام مچائے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوا دیہاتی عورتوں کے لئے براڈ کاسٹ ہونے کے واسطے ڈرامے کا 'ریہرسل' ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا، انسانی زندگی کی دُکھ درد کی کہانی کا کیا ہی مذاق بنتا ہے یہاں پر۔

اسی طرح اور چیزیں دیکھیں۔ اتنے میں ایک صاحب بہت سے کاغذات وغیرہ لئے ہوئے آگئے اور کچھ بات چیت اور سوال جواب کے بعد یہ طے پایا کہ میری تقریر کا بھی 'ریہرسل' ہو جانا چاہئے۔ اور اب یہیں سے میری مصیبتوں کی گھڑی شروع ہوتی ہے۔ ہم لوگ پھر اُس مخصوص کمرہ میں داخل ہوئے جس میں سے صرف تقریریں براڈ کاسٹ ہوتی ہیں۔ کمرہ نہایت ہی سجا ہوا تھا۔ ایک طرف صوبہ کے گورنر صاحب ایک تصویر میں سامنے 'مائک' رکھے تقریر کر رہے تھے۔ دوسری طرف صوبہ کے وزیر اعظم صاحب یہی کام انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح اور بھی کئی بڑی بڑی ہستیاں تصویروں میں دیواروں پر لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ اب تو میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ جس میز پر بیٹھ کر تقریر کرنی تھی وہ پھانسی کا تختہ لگنے لگی۔ مجھے پھانسی کا تو ذاتی تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایسا محسوس کرنے لگا جیسے

پھانسی کی بس تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سامنے دیوار پر جو گھڑی
لگی تھی اُس میں صرف کچھ گھڑی پڑی لکیریں نظر آئیں۔ یہ اور
غضب! پیچ ہیں اگر وقت دیکھنا چاہیئے تو وہ بھی ناممکن ۔
معلوم ہوا اس قسم کی گھڑیاں خاص طور سے ریڈیو ہی کے واسطے
بنتی ہیں، جو صرف منٹ بتاتی ہیں۔ سامنے جو، مائک، رکھا تھا
وہ بھی کچھ عجیب و غریب قسم کا تھا، یعنی اچھا خاصا شہد کی
مکھیوں کا چھتّا لگ رہا تھا۔

کمرہ بند ہو جانے کے بعد وہ دم گھونٹنے والا سکوت قائم ہوا
کہ بس ایسا محسوس کرنے لگا جیسے بغیر پانی کے گہرے کنوئیں میں
پڑا ہوں۔ کھانسی بُری طرح ستانے لگی۔ گلا سوکھ سوکھ کر پھنسا
جاتا تھا۔ "ریہرسل" کے بعد معلوم ہوا، تقریر ایک منٹ چھوٹی ہے۔
چاہا جلدی جلدی دو چار جملے اور گھسیٹ لوں۔ لیکن ایسے ماحول
میں قلم بھی ظالم کیا چلتا۔ چلتا کم، کاغذ میں گھستا زیادہ تھا۔
دیکھتے دیکھتے موت کی وہ گھڑی بھی آگئی۔ جو صاحب براڈکاسٹ،
کرنے والے تھے اُنھوں نے جھٹ ایک آلہ اُٹھا کر اپنے دونوں
کانوں پر اُلجھا لیا اور پھر میرے مسودہ کے صفحوں کو کاغذ کی
مختلف دقیقوں پر کیلیں مارنے لگے۔ میں نے پوچھا آخر یہ اہتمام

کیوں؟ اُنھوں نے بتایا کہ اگر صفحے اُلٹتے پلٹتے وقت ہل گئے تو دُور سننے والوں کو ایسا معلوم ہوگا جیسے ریڈیو ہاؤس میں پہاڑ اُلٹ پڑا۔ میں نے کہا "اگر ایسی بات ہے تو ضرور انھیں اچھی طرح جڑ دیجئے۔ گھر پر بی بی بچّے سنتے ہوں گے.....“ جملہ پورا نہ ہو پایا کہ ایک دم اُنھوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔ دل نے کہا مر گیا میں، آخر کیا ظلم! لال روشنی میز پر ہوئی۔ پڑھنے کے لیے اُنھوں نے بھوت کی طرح ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گلا رُوندھا، زبان لڑکھڑائی۔ لیکن جو پھر جھپک کھلی تو تقریر ختم ہوگئی۔ لال روشنی کی جگہ ہری روشنی میز پر ہوئی۔ اُنھوں نے کانوں پر سے آلہ اُتارتے ہوئے کہا "ایک منٹ پہلے ختم ہوا“ گھڑی کی طرف دیکھنا چاہا کہ داہنی طرف سے ایک دوسرے صاحب نے میرے سامنے بہت سے کاغذات رکھ دیے "بہت خوب!" جب تک بہت خوب، اور اس نئی مصیبت کا مفہوم سمجھتا تب تک اُنھوں نے مجھ سے دو جگہ دستخط کرا لئے تھے۔ داہنے ہاتھ سے چک دیتے ہوئے اُنھوں نے میرے سامنے بایاں ہاتھ پھیلایا۔ جیب سے اکنّی نکال کر اُن کے ہاتھ پر رکھی تھی کہ پہلے

صاحب میرے واسطے کمرہ کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ جلدی سے باہر نکلا۔ دو قدم آگے چل کر جو میں نے اُن سے اپنی تقریر کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو مڑ کر دیکھا وہ دونوں صاحب غائب ہو چکے تھے۔ پریشان ہو کر تیز قدم چلنے لگا۔ ریڈیو ہاؤس کی سیڑھیوں پر سے جس وقت اتر رہا تھا باہر برآمدہ میں "مائکروفون" گا رہا تھا۔ "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے"

———۰۰———

سوچ

یہ بھی زندگی میں کوئی زندگی ہوئی، سروجنی بار بار یہی سوچتی۔ برابر یہی سوچا کرتی اور ہمیشہ سوچتی رہتی۔ جتنا ہی سوچتی اُتنا ہی جیسے سوچ اُسے کھائے جاتا۔ سوچ بدن میں گھن جیسا لگ جاتا ہے۔ لیکن خیریت یہ تھی کہ ابھی سروجنی کو اِس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ جس روگ کی ماری مر رہی تھی وہ دراصل کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا دُکھ اتنا نہ تھا، بلکہ اُس کی زندگی خود، جو اُس کے واسطے ہر چیز کی کمی کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوئی تھی، اُس کے فکر کا کارن تھی۔ سروجنی کے لئے یہ اچھا تھا کیونکہ جس دن اُسے یہ معلوم ہو جاتا کہ دراصل جس روگ کے گھن اسے لگ گئے تھے وہ صرف فکر تھا تو پھر اُس سوچ کے روگ سے وہ کبھی بھی نہ بچتی۔ غرض کہ سروجنی جب اپنے اُس ذہنی اُدھیڑ بُن میں لگی رہتی تو کبھی یہ ماننے کو تیار نہ ہوتی کہ اپنے سوچ کی وجہ

وہ خود تھی۔ بلکہ اپنی زندگی کو اُس فکر یا چنتا کی وجہ سمجھتی ــــ
سروج بابو ہمیشہ اُسے سمجھاتے کہ اُس کی ساری چنتا اور دکھ
کی وجہ وہ خود تھی کیونکہ ہر چھوٹی یا بڑی بات پر بے وجہ فکر
کرنے کی جیسے اُس کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ لیکن سروجنی اُس بات
کو مانتی بھی کیسے جب وہ کئی سال تک اپنی اُس زندگی کو،
جو اُس کی زندگی بن گئی تھی، لگاتار دیکھتے رہنے کے بعد اس
نتیجہ پر پہونچی تھی۔ سروجنی کے لئے اچھا ہی تھا جو اُس نے
سروج بابو کی بات کبھی نہ مانی، کیونکہ سروج بابو تو ایسا کہہ
کر جیسے اُسے زہر ہی پلاتے رہے تھے، جیسے اگر وہ بغیر کسی
اعتراض کے پی لیتی تو سروجنی آج سروجنی کہاں ہوتی۔
اِس درمیان میں مکڑے نے کھڑکی کے کونے میں کئی بار
گھوم کر اپنے آٹھ پیل کے مکان میں جالے کے چار تار اور
ڈال دیئے تھے۔ بیچ میں مکڑی بھاری پیٹ لئے بیٹھی کھن
بھن کر رہی تھی۔ اور سروجنی نظر جمائے ایک ٹک دیکھ رہی
تھی۔ اُس کا بایاں ہاتھ رہ رہ کر بچہ کی جانگھ پر اب بھی پڑتا،
حالانکہ بچہ روتے روتے گود میں کب کا سو گیا تھا۔ بچہ سویا
تھا اور زندہ تھا اس وجہ سے معلوم ہوتا کہ سانس لینے کی

وجہ سے اُس کا پیٹ دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ سروجنی کی آنکھیں کھُلی اور خاموش تھیں۔ اُس سے معلوم ہوتا کہ وہ جاگ رہی تھی۔ اُس کے زندہ ہونے کا ثبوت تو یہ تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر پر اُس کا داہنا ہاتھ سوئے ہوئے بچے کی جانگھ پر اب بھی پڑتا تھا۔ جالے کے بیچ میں، موٹی مکڑی بھن بھن کر رہی تھی۔ مکڑا ہر لمحہ گھوم گھوم کر جالے کے آٹھ پہل مکان میں ایک تار اور ڈال دیتا تھا۔ سروجنی بیٹھی ایک ٹک زندگی کا وہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔

کاش تم نے بھی کبھی بھول کر ہی سوچا ہوتا کہ ہم بھی آخر آدمی تھے۔ دُکھ سُکھ ہم کو بھی مار اور جلا سکتا تھا۔ ہم بھی سُکھ سے سُکھی اور دُکھ سے دُکھی ہوتے تھے۔ ہماری بھی اپنی ایک زندگی تھی۔ لیکن تم نے اپنی زندگی کے آگے میری زندگی کو کچھ سمجھا نہیں۔ مگر آج میں کس سے اِس کا رونا روؤں۔

مکڑے نے جالے کے آٹھ پہل کے مکان میں چکر لگا کر ایک اور جالے کا تانا تن دیا تھا اور مکڑی بیٹھی بدستور بھن بھن کر رہی تھی۔ سروجنی کا ہاتھ بچے کی جانگھ پر جہاں دیر سے پڑا تھا وہاں ہاتھ کے نیچے بچے کی جانگھ پسینے سے بھیگ

گئی تھی۔

لیکن تمھاری زندگی اُسی رفتار سے چلتی رہی جو تم نے اپنے اور دوسروں کی زندگی کے لئے ضروری سمجھ رکھا تھا۔ میں بار بار تم سے کہتی رہی کہ دنیا ایسے ہی رہے گی، زندگی اپنی ہی رفتار سے چلے گی۔ تم اُس کی چال بڑھا نہیں سکتے۔ اِس لئے اگر ہو سکے تو تم ذرا اپنی طرف بھی توجہ دو۔ اپنی طرف توجہ کر کے تم میری طرف بھی توجہ کرتے اور اِس کی طرف بھی۔

سروجنی کا داہنا ہاتھ جو بچے کی جانگھ پر بے حرکت پڑا تھا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُٹھ کر پھر گرتا اگر اُسی وقت اُس کو اِس کا احساس نہ ہو گیا ہوتا کہ بچہ سو گیا تھا، اور اب اور تھپکیاں دینے سے وہ سونے کے بجائے جاگ جائے گا۔ اُس کی جانگھ پر سے اُس نے آنچل سے پسینہ پونچھا۔ پھر آنچل کا کونا آنکھوں تک لے گئی۔ لیکن آنسو کہاں تھے جو پونچھتی۔

مکڑا جالا بن کر اپنا مکان آدھے سے زیادہ تیار کر چکا تھا۔ مکڑی بیچ میں بیٹھی بھن بھن کر رہی تھی۔

سروج بابو سے سروجنی کو جو بھی شکایت ہو، لیکن یہ نہیں
کہا جا سکتا کہ سروج بابو نے اپنی زندگی کامیاب اور سروجنی
کی زندگی سکھی بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اصل میں
ایسا کون ہے جو جان بوجھ کر اپنی زندگی ناکامیاب بنانا چاہتا
ہے۔ سروج بابو ہمیشہ یہی سوچتے اور آخر اِس نتیجہ پر پہونچتے
کہ زندگی کامیاب یا ناکامیاب بنائی نہیں جاتی بلکہ وہ
کامیاب یا ناکامیاب ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر آدمی اپنی اچھی
یا بری طبیعت اور عادتوں کا شکار ہو کر رہنا چاہتا ہے اور
عموماً رہتا ہے۔ اخیر میں انجام یہ ہوتا ہے کہ اُنھیں میں سے
کچھ کی زندگیاں کامیاب اور کچھ کی ناکامیاب ہوتی ہیں۔
یہ بات اس وجہ سے بھی صحیح ہے کہ ہر آدمی جو اپنی زندگی
کامیاب بنانا چاہتا ہے اُس کی زندگی ہمیشہ کامیاب
نہیں ہوتی۔ بلکہ کفایت اور کنجوسی کرتے کرتے لوگ فاقہ مست
ہو جاتے ہیں۔ سچ بولتے اور ایمانداری کرتے کرتے لوگ
مہاجنوں اور ساہوکاروں کے ہاتھوں بِک جاتے ہیں۔
محنت اور مشقت سے کام کرنے والے مر جاتے ہیں، لیکن
اپنے بچوں کے واسطے ہمیشہ پاس بینک میں روپیہ نہیں چھوڑ

جاتے۔ سروج بابو نے جہاں یہ سب دیکھا تھا وہاں اُنھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جواڑی اکثر لکھ پتی ہو کر مرے۔ فریبی اور دغابازوں نے زندگی محرری سے شروع کر کے اُسے ریاست کی دیوانی پر ختم کی۔ جال کرنے والے اور دھوکا دینے والے عام طور سے کامیاب رہے۔ اور نہیں بھی کامیاب رہے۔ اور جب کوئی ٹھگ اونچے درجہ پر پہونچ گیا تو نجومیوں نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر بتایا کہ اُسے کروڑ پتی ہونا لکھا تھا۔ سب کرموں کے پھل ہیں!

سروج بابو جب بھی سروجنی اور اُس کی زندگی سے پریشان ہو کر سوچتے تو اِسی نتیجہ پر پہونچتے کہ زندگی کامیاب بنائی نہیں جاتی، وہ کامیاب ہو جاتی یا نہیں ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اگر وہ سروجنی کو آسودہ اور خوش کرنے کی کوشش بھی کرتے تو کیا کرتے۔ سروجنی چاہتی بھی تو کوئی ایک چیز نہیں تھی۔ وہ کھانے کو کھانا، پہننے کو کپڑا، رہنے کو مکان، کام کرنے کو نوکر، جلانے کو لکڑی، اور پیسنے کو مسالہ چاہتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اُسے زکام نہ ہو، اُس کا بچہ دُبلا اور بیمار نہ ہو، محلہ میں شور اور غل نہ ہو، راتیں اتنی

اندھیری نہ ہوں، چاندنی اُجیالی نہ ہو۔ خود سروجنی ایسی نہ ہو اور سروج بابو جیسے تھے ویسے نہ ہوں۔ چنانچہ سروج بابو بار بار یہی سوچتے کہ اگر مر کھپ کر کسی صورت سے وہ زندگی کامیاب بھی بنالیں، یعنی اُس زندگی میں سُوکھی لکڑی، گرم مسالہ، ٹھنڈے کپڑے اور بیماریوں کو اچھی کرنے والی دوائیاں مہیّا بھی کرلیں تب بھی سروجنی کو خوش کرنے کے لئے سورج نکلنے کا وقت کیسے بدل سکتے تھے، درختوں کو چھوٹا یا بڑا کیسے کر سکتے تھے، سروجنی کو کیسے کچھ اور بنا سکتے تھے، یا خود اپنے کو کیوں کر بدل سکتے تھے۔ جب وہ اِس طرح سوچتے تو آخر میں پریشان ہو کر ہمیشہ اِسی نتیجہ پر پہنچتے، یہی زندگی ہے، وہ ایسی ہی ہوتی ہے اور ایسی ہی رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اتنے اُداس نتیجہ پر پہنچتے تو اُس وقت اُنھیں اپنی زندگی کا وہ پورا ڈرامہ یاد آنے لگتا جس کے خاص منظروں کو جیسے اُن کے کانوں میں کوئی اونچی آواز سے اُنھیں سناتا ہوتا۔

تمھاری زندگی کب اور کیسے شروع ہوئی، یہ تم نہیں جانتے۔ کب اور کہاں ختم ہوگی یہ بھی تم نہیں جان سکتے۔ تم جو جانتے ہو وہ بس یہی ہے کہ نویں درجہ تک تم کھاتے پیتے

اور پڑھتے لکھتے رہے اِس لئے کہ تمھارے ماں باپ کی
اِتنی حیثیت اور ایسی مرضی تھی۔ پھر زندگی کا چکر چلا اور
تم سمجھتے ہو کہ اُسے تم نے چلایا۔ لیکن یہ تم کیا جان سکتے ہو
کہ اس دنیا اور اس زندگی کا چکر کون چلاتا ہے۔ بہرحال
جو تم سمجھتے ہو وہ تم بھی سمجھنے پر مجبور ہو اور وہ تم سے کوئی
چھین نہیں سکتا۔ درجہ میں کاشی ناتھ تم سے دُور بیٹھا تھا۔
لیکن اُس سے دُور رہ کر بھی تم اُس کی طرف کھینچنے سے
اپنے کو روک نہ سکے۔ تم سوچتے ہو کہ کاشی ناتھ کی طرف جو
تم اِتنے کھینچ گئے وہ اُس کی ذات کی کشش تھی۔ جو بھی ہو۔
چوڑے اور اُبھرے ہوئے سینے کے کاشی ناتھ نے جب تمھیں
اپنی طرف کھینچتے دیکھا تو اُس نے تمھیں پرکھنا چاہا کیونکہ
کاشی ناتھ کی رائے میں آدمی آدمی نہیں ہوتے تھے بلکہ لوہے
یا لکڑی کے ٹکڑے تھے۔ اِس لئے جس طرح لوہے یا لکڑی
کے ٹکڑے کو ٹھونک پیٹ کر اُن کو جس لایق پایا جاتا ہے
اُن سے ویسا کام لیا جاتا ہے، اُسی طرح وہ آدمی کو
پرکھ کر اُس کو جس لایق سمجھتا تھا اُس سے ویسا کام
لیتا تھا۔ جس قسم کا اُس کا کام تھا اُس میں ضرورت ہر طرح

کی چیزوں کی بنتی - یعنی اُسے مٹی کی بھی ضرورت تھی، لکڑی کی اور لوہے کی بھی - چنانچہ اُس نے تمھیں لکڑی سمجھ کر لکڑی کی طرح پرکھنا چاہا، کیونکہ لکڑی بھی طرح طرح کی ہوتی ہے - کوئی شیشم ہوتی ہے تو کوئی آم، جو جلانے میں اچھی ہوتی لیکن زمین پر پٹکنے پر کھٹ سے ٹوٹ جاتی ہے - اِملی کی لکڑی خوب جلتی ہے، نیم کی جلتی بھی نہیں، لیکن اُس میں دیمک نہیں لگتی - لکڑیوں میں ساکھو سَو سال کھڑا رہتا ہے، سو سال پڑا رہتا ہے اور سو سال میں سڑتا ہے - لکڑی کی طرح آدمی بھی ہوتا ہے - اِس لئے اُس کی پہچان بھی لکڑی کی طرح ہونی چاہیئے، کاشی ناتھ کا ایسا خیال تھا -

چنانچہ اِس پہچان کی غرض سے کاشی ناتھ جب اُس بھوت والی کوٹھی کے پیچھے آم کے باغ میں مالی کی خالی کوٹھری میں اکیلے رہتا تھا تو اُس نے تم سے بتایا کہ اُس سے اگر تم ملنا چاہو تو صرف ۹ بجے رات کو مل سکتے تھے - بھوت والی بڑی کوٹھی جب سے بنی تھی تب ہی سے خالی تھی - اُس میں نہ کبھی کوئی رہا اور نہ کسی کی رہنے کی ہمت ہو سکتی تھی - پیچھے آم کے درختوں کا اندھیرا باغ تھا،

جو چار دیواری سے گھرا تھا۔ باغ کے بیچ میں کاشی ناتھ اس ویران کوٹھری میں رہتا تھا جو باغبان کے رہنے کے لئے بنی ہوگی۔ معلوم نہیں کاشی ناتھ وہاں اپنے کام کی سہولت کی غرض سے شہر سے اتنی دور رہتا تھا یا اس وجہ سے کہ اس کوٹھری میں رہنے کا اسے کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ بہر حال تم سے جب اس نے کہا کہ نو بجے رات ہی کو اس سے تم مل سکتے تھے تو تم نے بھی سمجھا کہ بقیہ وقت کاشی ناتھ مشغول ہونے کی وجہ سے کہیں اور رہتا تھا۔ اگر تمھیں اس میں کچھ شبہہ ہو سکتا تھا تو وہ شبہہ اس رات کو دور ہو گیا جب غلطی سے نو بجے کے بجائے دس بجے رات کو اس اندھیری کوٹھری میں داخل ہو کر تم نے دیا سلائی جلانے کے بعد دیکھا کہ کاشی ناتھ بیچ کمرہ میں پیر اوپر کئے آنکھوں کے سامنے بھگوت گیتا کھولے سر کے بل کھڑا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر تمھاری تو جان ہی نکل گئی۔ لیکن جب کاشی ناتھ نے تم سے بتایا کہ اس طرح اندھیرے میں ورزش کرتے وقت وہ الٹی آنکھوں سے بھگوت گیتا پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا تب تمھاری سمجھ میں آیا کہ جو شخص اس طرح اپنی جسمانی اور روحانی طاقتوں کو برچھی کی نوک کی طرح تیز کرتا ہو وہ رات کے نو بجے کے علاوہ کسی اور وقت تم سے مل بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن دراصل

کاشی ناتھ تمھیں لکڑی کی طرح زمین پر پٹک کر پڑھ رہا تھا یہ تو تمھیں پلینگ کے مریض کاشی ناتھ کے واسطے اندھیری راتوں میں بارہ روز تک کھانا پہنچانے کے بعد معلوم ہوا جب موت کے منہ سے نکل کر کاشی ناتھ نے مسکرا کر تم سے کہا۔ "تم ڈرے نہیں"۔

لکڑی سے کام اُسکی ذلت پہچان کر ہی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ خبر آئی کہ شیکھر داد اپولیس کی گولی کے شکار بنے تو یہ کام تمھارے ہی سپرد کیا گیا کہ تم ایک سو چوبیس میل سائیکل پر جا کر اس کی تصدیق کرو کہ وہ شیکھر ہی دادا تھے یا کوئی اور شخص تھا۔ ریل سے نہیں کوئی جا سکتا تھا کیونکہ اُس قسم کی خبر اخبار میں نکلوانا پولیس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ جب کوئی ریل سے خبر کو تصدیق کرنے کے لئے روانہ ہوتا تو اُسے گرفتار کر لیا جاتا اور پھر اس طرح سارے انقلابیوں کا پتہ چل جاتا۔ لیکن جب تم دو سو اڑتالیس میل سائیکل چلا کر یہ خبر لائے کہ پولیس کے مقابلہ میں پستول چلاتا ہوا جو شیر زمین پر گرا تھا وہ شیکھر ہی تھا تو یہ ضروری ہو گیا کہ اُس کی جگہ امید سنگھ لے لے اور امید سنگھ کی جگہ کاشی ناتھ کو دیدی جائے اور کاشی ناتھ کی باغ والی کوٹھری تمھارے سپرد کر دی جائے۔

اندھیری کوٹھری میں جب تم سر کے بل کھڑے ہو رہے تھے

اور بھگوت گیتا اور سوامی ویویکا نند کی کتابیں پڑھ رہے تھے اُسی زمانہ میں بھوت والی کوٹھی میں وہ نیا بنک کھلا۔ بنک کھلنے سے پہلے بھوت والی کوٹھی میں لکشمی کی پوجا ہوئی۔ اُس پوجا اور پرارتھنا کی وجہ سے معلوم نہیں کوٹھی چھوڑ کر بھوت بھاگ گیا یا نہیں۔ لیکن شاید یہ سوچ کر کہ جہاں لکشمی رہیں گی وہاں بھوت نہیں رہ سکے گا بنک کے منیجر صاحب کوٹھی کے پیچھے کے حصّے میں رہنے کے لئے آ گئے۔

اُس وقت سروجنی کا نام سروجنی نہیں تھا۔ اُس کا اصلی نام مُنّی تھا۔ سروجنی نام تو تم نے اپنی سہولت کے لئے رکھا لیکن یہ مُنّی کے پتاجی کو بھی کہاں معلوم تھا کہ مُنّی کا نام سروج تم نے رکھا تھا۔ بنک کے منیجر صاحب تو یہی سمجھے تھے کہ کویتا لکھنے کے لئے مُنّی نے اپنا دوسرا نام سروج رکھ لیا تھا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ مالی کی کوٹھری میں سے سوامی رام تیرتھ، لاجپت رائے اور سنڈرلینڈ کی کتابیں لا کر مُنّی کرانت کاری بن گئی تھی۔ سروج نام رکھا گیا تھا، سی۔ آئی۔ ڈی کو دھوکا دینے کے لئے۔ وہ سروج تو صرف دھوکے کی ٹٹی تھی۔ اصلی سروج تو تم تھے جو باغ کی اندھیری کوٹھری میں بیٹھے "پکرک ایسڈ" کے دھوئیں اُٹھایا

کرتے تھے۔

لیکن یہ تم نے نہ سوچا کہ بنک کے منیجر کے گھر میں جو دھواں سروج کے دل میں اس وقت اٹھ رہا تھا وہ ہر طرح سے تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل کے واسطے زیادہ اہمیت رکھتا تھا بہ نسبت اس تیزابی دھوئیں کے جو تمہاری کوٹھری میں بارہ بجے رات کے بعد اُٹھتا تھا۔ تم سروج سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ جلد ہی تمہارے دل میں بھی وہ سروجنی بن گئی۔ تم نے سوچا کہ ایک جیون ساتھی پاکر تو دشمن کے تم پیر ہی میدان سے اکھاڑ دو گے۔ ہمت سنگھ نے اشارہ ضرور کیا کہ جو کچھ کرنا وہ سوچ سمجھ کر کرنا اس لئے کہ شیکھر دادا اپنی زندگی میں ہمیشہ پارٹی میں عورتوں کے آنے کے خلاف رہے۔ لیکن تم نے سب کو یہ سمجھایا کہ سروجنی کی وجہ سے کام میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ مگر جہاں تم نے ہمت سنگھ کو اس طرح خاموش کر دیا وہاں تم سروجنی کے دل کو خاموش نہ کر سکے جو تمہارے دل سے مستقبل خاموش باتیں کرتا رہا۔ تم اُس وقت یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ جو تم اتنے جلد سروجنی سے مل کر ایک ہو گئے تھے اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ انقلابی کام اُس کے بغیر چل نہیں سکتا تھا یا اُس کی وجہ سے وہ کام

زیادہ تیز چلنے لگا تھا، بلکہ سروجنی کے ایک اشارہ کو تمھاری آنکھوں نے دو اِس وجہ سے سمجھنا چاہا کہ تمھاری زندگی اینٹ کی طرح سخت تھی، سروجنی کی گلاب کی پنکھڑیوں جیسی ملائم تھی، تمھاری زندگی کانٹا تھی، اُس کی کلی تھی، تمھاری زندگی تیزاب تھی اور اُس کی کیمیا تھی۔

لیکن جس لکڑی کے ٹکڑے کو کاشی ناتھ نے شیشم سمجھا تھا وہ ساکھو ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ رام تیرتھ اور ویویکانند کے پیغام بھی تم کو اُس راستہ سے چلنے سے روک نہ سکے جس سے سروجنی تم کو چلانا چاہتی تھی۔ اور جب تم نے سروجنی کی ضد کے جواب میں لفظ "ہاں" اپنی زبان سے نکالا اُس وقت بھی تمھاری اندھیری کوٹھری کے طاقوں پر میزنی کی تقریریں، گیری بالڈی کی انقلابی کہانی، ویڈا فگنر کی سوانح عمری، اور آئرلینڈ کی عدالت میں راجر کیس منٹ کے بیان کی جلدیں رکھی تھیں۔ تمھارے ماں باپ نے بھی، چاہے وہ جہاں رہے ہوں، تمھارے اُس "ہاں" کو سُنا ہوگا۔

اگر تم بنگال چلے گئے ہوتے تب بھی وہ انقلابی آگ، جو اُس وقت یک بیک بھڑک اُٹھی تھی، بجھنے سے رُکتی نہیں۔

راس بہاری نے جو ڈیمکرک ایسڈ کا نسخہ بنگال کو دیا تھا وہ تمھارے اور سروجنی کی کیمیا سے کہیں زیادہ جاندار اُس وقت بھی تھا لیکن تاریخ ہر نسخہ کو بدل دیتی ہے۔ اس لئے وہ آگ جلد ہی بجھ گئی۔ لیکن اُس سے بھی پہلے تم بجھ گئے۔ کاشی ناتھ نے دوڑ دھوپ کر تمھیں سودیشی بنک میں نوکری دلا دی۔ یہی اُس کے لئے کیا کم تھا۔ تمھارے کوٹ کی داہنی جیب میں نہ اب ریوالور تھی اور نہ بائیں جیب میں سلفیورک ایسڈ۔ تم دفتر میں بیٹھے دوسروں کے بنک بیلنس، جوڑتے گھٹاتے رہتے تھے۔ سروجنی کا بدن اب انقلابی اشتہاروں سے نہیں بلکہ زندگی کے سورج سے بھاری رہتا تھا۔ لڑکے کا نام کرانتی تم نے رکھا۔ لیکن چھ مہینے کا ننھا کرانتی بھی تمھاری بنک کی نوکری اور سروجنی کی تقدیر میں کیا انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ انقلاب کا وقت اصل میں گذر گیا تھا۔ اب تو تمھیں جتنے دن جینا تھا اُتنے دن ایک روپیہ تین آنہ یا ایک روپیہ پانچ آنہ روز کما کر جینا تھا۔ جس دن تم ٹکے سیر بھنڈی کے بجائے ایک آنہ سیر آلو شام کو بازار جا کر خریدتے تھے وہ دن تمھاری زندگی میں انقلابی ہوتا تھا۔

آواز خاموش ہو گئی تھی۔ زندگی کا چراغ بجھ گیا تھا۔ مکڑا
جالا بُن کر چلا گیا تھا۔ مکڑی اکیلے بیٹھی بھن بھن کر رہی تھی۔
سروجنی کھڑکی کے کونے میں جالے پر تکتے تکتے جیسے یک بیک
نیند سے جاگ اُٹھی۔ پیٹ میں جیسے کچھ کلبلایا۔ ایک دم وہ کانپ
گئی۔ بچّہ کو لے جا کر چارپائی پر لٹا کر خود پٹّی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی رہی
اور سوچتی رہی۔ اپنے دل کی بات کیسے اور کس سے بتاتی۔

سروجنی کے سوچ سے سروج بابو دفتر میں سوچتے سوچتے
مر گئے۔ لیکن سروجنی کا سوچ آج بھی نہ گیا۔ وہ یہی سوچ رہی
تھی کہ آدمی کا پیشہ بھلے ہی چھوٹ جائے لیکن اُس کی عادت
نہیں چھوٹتی۔ چنانچہ جہاں وہ انقلابی کتابیں، پستول، ریوالور
اور تیزاب سب پیچھے چھوٹ گئے تھے وہاں سروج بابو کا شام
کے وقت دریا کا نہانا اب بھی نہیں چھوٹا تھا۔ کئی دن سے
طبیعت بھاری رہ رہی تھی۔ لیکن حرارت کی شکایت کس سے
کرتے۔ سروجنی اپنی ہی زندگی کی حرارت میں تپ رہی تھی۔
اس لئے اُس سے اپنے بخار کا حال کہہ کر وہ اپنا بخار بھلا
کیا کم کرتے۔ سروجنی جہاں اُنھیں اور بہت سے کام کرنے
سے منع کرتی تھی وہاں اُسے اُن کا دریا نہانے جانا بھی پسند

نہ تھا۔ لیکن، وہ سوچتی، سروج بابو اُس کا کہنا مانتے ہی کہاں تھے جو یہ مان لیتے۔

اُس شام کا نہانا جیسے اُن کے لئے کال ہو گیا۔ تیز بخار جب ہلکا ہوتا تو وہ سوچنے کی کوشش ضرور کرتے۔ لیکن بخار نے دماغ بیکار کر دیا تھا۔ جب سوچنے کی کوشش کرتے تو وہ محسوس کرتے جیسے اُن کے اندر ایک ڈر سما گیا ہے۔ اُسی وقت سرہانے بیٹھی سروجنی دُکھ کی آواز سے کہتی۔ "تم سے کتنی رہ گئی کہ دریا کا نہانا چھوڑ دو"۔ سروج بابو اُس وقت یہ سوچتے کہ اگر وہ شام کو دریا میں نہ نہاتے تو سروجنی کی دی ہوئی اپنی زندگی کی حرارت کیسے کم کرتے۔ پھر وہ چارپائی پر پڑے پڑے کمرہ کے چاروں طرف دیکھتے اور ایک انجان ڈر سے کانپ اُٹھتے۔ بخار تیز ہو جاتا اور آنکھیں بند ہو جائیں۔

سروج بابو کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ ماں باپ بیچاروں سے جو کچھ ہو سکا اُنھوں نے وہ کیا۔ لیکن مرنا جینا کس کے بس کا ہوا جو اُن کے بس کا ہوتا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر نے آلہ سے سینہ جانچ کر اور نبض دیکھ کر کوئی دوا انہیں تجویز کی تو سروج کے ماں باپ نے یہی سوچا کہ نہ اُس کی زندگی

میں وہ کچھ کر سکے اور نہ آج اُس کے مرنے میں کچھ کر سکتے ہیں۔

جس وقت سروج بابو کی آنکھیں سروجنی کے چہرے پر سے ہٹ کر چھت کی طرف رُخ کرنے لگیں تو اُس کی زبان سے صرف اِتنا سُنائی پڑا۔ "سروجنی بس اور کچھ نہیں کر سکا۔ کاشی ناتھ"

سروجنی چارپائی کی پٹّی پر سے اُٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ مکڑی کے جالے میں ایک بڑا سا مکھا آ کر پھنس گیا تھا۔ لیکن مکڑی جب تک اُسکے گرد جالا بُن کر اپنے جالے میں اُسے پھنسا پاتی تب تک مکھا جالا پھاڑ کر نکل گیا تھا۔

جس وقت سروج بابو کی لاش آنگن سے اُٹھنے لگی سروج کے چھوٹے بھائی نے ڈھائی سال کے کرانتی کو لا کر اُس کے ہاتھ سے اُس بانس کو چھُلا دیا جس پر رکھ کر چار آدمی سروج بابو کی مٹّی کو اُٹھا رہے تھے۔ سروجنی نے لاش اُٹھتے وقت جب یہ چاہا کہ دروازہ زبردستی کھول کر آنگن میں چلی جائے تو اُس وقت وہ صرف اِتنا دیکھ سکی تھی۔ عورتوں نے اُسے

اندر کھینچ کر باہر سے کنڈی چڑھادی۔

جب سورج بابو کو اُس دریا میں ڈال کر لوگ آ گئے ، جو اُسے انقلابی اندھیری کوٹھری میں رہنے کے زمانہ سے پسند تھا، تو عورتیں سروجنی کو پکڑ کر اُسے آنگن میں نہلانے کے لئے لے گئیں۔ لیکن جب سروجنی نے اپنا سہاگ دھونے کے لئے ہاتھ سے لوٹے کا پانی اٹھایا تو گھر کی عورتیں بھاگ کر کمرہ میں چھپ گئیں۔ جس کا شوہر زندہ ہو گا وہ ایسا بد شگون کیوں دیکھے گا۔ جب سروجنی ماتھے کا سیندور دھو کر بغیر کنارے کی ساڑی پہن چکی تو گھر کی عورتیں آنگن میں آئیں۔ پھر اُسے ایک چھوٹے کمرہ میں لے جاکر انھوں نے بیٹھا دیا۔ آٹھ دن اُسی کمرہ کی فرش پر سروجنی پڑی رہی۔ کرانتی کو لوگوں نے اُس سے الگ کر دیا تھا۔ جب وہ بہت روتا تو اُسے لاکر عورتیں سروجنی کا بدن اُس سے چھوا لے جاتیں۔ دسویں دن سروجنی کو زندگی میں پھر سے ایک بار رنگین ساڑی پہنائی گئی۔ پھر چوڑیاں پہنائی گئیں۔ ماتھے میں سیندور اور پیر کی انگلیوں میں سُرخ رنگ لگایا گیا اس کے بعد وہ سیندور پھر سے دھویا گیا۔ رنگ کوئلے سے رگڑ رگڑ کر مٹایا

گیا۔ چوڑیاں پتھر سے ایک ایک کر کے چور کی گئیں۔ رنگین ساڑی اُتار کر اُسے سفید ساڑی پہنائی گئی۔ گھر کی دوسری عورتوں نے رنگین ساڑیاں پہنیں، ماتھے سیندور سے رنگے، پیر گلابی رنگ سے چمکائے۔ جس کا مرد نہیں تھا اُس نے وہ کیا۔ جن کے مرد تھے اُنھوں نے یہ کیا۔ سروجنی ہندو گھر کی وِدھوا ہے اِس لئے بغیر کنارے کی سفید ساڑی پہنے سوچتی ہے — دنیا کے مرد مر جائیں گے عورتیں بھی مر جائیں گی — لیکن یہ نہ مرے گا۔

سروج بابو کے مرنے کے بعد کاشی ناتھ جب ضمانت پر چھوٹے تو سروجنی سے ملنے آئے۔ باہر کچھ دیر سروج بابو کے پتا سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر جب اُنھوں نے سروجنی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اُن سے بتایا گیا کہ یہاں یہ رواج نہیں ہے۔ کوئی باہر کا آدمی گھر کی بہو سے نہیں مِل سکتا تھا۔ کرتے کیا، چُپ ہو گئے۔ حالانکہ جب سے اُنھوں نے یہ سُنا تھا کہ سروج بابو مرتے وقت اُنھیں کا نام زبان پر لائے تھے وہ سروجنی سے مِل کر جاننا چاہتے تھے کہ آیا وہ جینے والوں کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔

سروج بابو کی جو کمائی سروجنی کی کسی بھی ضرورت کو پوری نہ کر سکی اُس کی قیمت کا احساس آج سروج کے نہ رہنے پر اُس کے والد کو ہو رہا تھا۔ پنشن اتنی نہیں تھی کہ بیچارے گھر کا خرچ چلا سکتے۔ چھوٹا لڑکا ابھی ملازمت کی تلاش ہی میں تھا۔ ایسی حالت میں سوائے خرچ گھٹانے کے آمدنی بڑھانے کی کہاں سے سوچ سکتے تھے۔ اِس لئے تھوڑے کرایہ کے مکان کی تلاش میں تھے اور اسی سوچ میں سارا دن حُقّہ پیتے پیتے بِتا دیتے تھے۔ بی بی اندر سے بار بار آ کر ڈیوڑھی میں کھڑی ہو کر سمجھا جاتیں ”مکان لیتے وقت خیال رکھنا کہ اغل بغل کے مکان میں کوئی نوجوان آدمی نہ ہو۔“

جس مستعدی سے چھوٹا بھائی ملازمت ڈھونڈنے میں لگا تھا اُسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ سروج بابو کی موت کا سب سے زیادہ اثر اُسی پر پڑا تھا۔ بھابھی کے پاس جا کر اکثر بیٹھتا اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کرتا۔ ماں کو یہ بات کم پسند آتی۔ چنانچہ محلّہ کی عورتیں جب گھر میں آتیں تو اُسے سُنا سُنا کر وہ کہتیں ”جوتشی نے جنم پتری دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ اگر ہمیں شادی کی ذرا بھی خبر ملتی تو ہم ایسی جگہ ہرگز لڑکے کی شادی“

نہ ہونے دیتے۔" چھوٹا بھائی اِس قسم کی باتیں گھر میں آتے جاتے سُنتا اور سُنی کو اَن سُنی کر دیتا۔ ماں پر حیرت کرتا۔ کہاں سے انھیں بھابھی کی کُنڈلی مِل گئی جو یہ اُسے پنڈتوں کو دکھاتی پھر رہی ہیں !

سروجنی سوئے ہوئے کرانتی کے سرہانے چارپائی پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کب تک اِس سوچ سے مرگی۔ جب سے سروج بابو کی ماں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ سروجنی کے پیٹ میں بچّہ ہے تو وہ اُس سے دن میں اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم دو بار ضرور پوچھتیں کہ بچّہ کب تک پیدا ہوگا ۔ سروجنی بالکل ٹھیک تاریخ بتا بھی کہاں سے دیتی ۔ اِس سے وہ اور کڑھتیں ۔ پھر اپنے من سے اُلٹا سیدھا مہینوں کا کچھ حساب جوڑ کر ڈیوڑھی میں جاتیں اور اپنے بوڑھے سے کہتیں ۔" معلوم تو سروج ہی کا ہوتا ہے۔"

چھوٹے بھائی کی پریشانی اور سوچ نوکری پا کر بھی نہ ختم ہوئے ۔ کم تنخواہ میں سروجنی اور اُس کے بچّے کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا ۔ جو کچھ پاتا باپ کو لا کر دیتا ۔ روپیہ جب ہاتھ میں آیا تو ماں باپ چھوٹے لڑکے کی شادی کی

فکر میں پڑے ۔ لڑکے نے جب یہ سُنا تو اُس پر وہ سوچ
سوار ہوا کہ سروجنی کے سارے سوچ کو وہ بھول گیا۔
اور سروجنی کو جب یہ معلوم ہوا کہ بڑھیا کے علاوہ ایک
اور سُہاگن گھر میں آ رہی ہے تو اُس نئے سوچ سے وہ
کانپ کر رہ گئی ۔
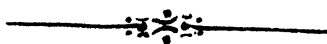
میں کیسے لکھتا ہوں۔ کہانی

خیریت ہوئی سوال یہ پوچھا گیا کہ میں کیسے لکھتا ہوں، ورنہ اگر یہ پوچھ لیا گیا ہوتا کہ آپ لکھتے کیوں ہیں تو کم سے کم میری تو گت بن گئی ہوتی۔ جہاں دنیا میں ہزاروں اور کام ہیں وہاں کچھ لوگ خواہ مخواہ قلم ہی گھسنا اپنا پیشہ کیوں بنا لیتے ہیں، یہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آتا۔ اور اگر قلم چلانا اپنا پیشہ بنا کر یہ لوگ اپنی بلا سے جیتے مرتے تو کسی کو اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا، لیکن مصیبت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب یہ لوگ سماج اور سمے کو اندھا قرار دے کر دُنیا کو راستہ دکھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ اپنی نظر میں اِس نہایت ہی نیک کام کے لئے یہ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دنیا والے اِن کے اور اِن کے بچّوں کے پیٹ

بھریں اور اُنھیں خوشحال رکھیں۔ اور اگر کبھی ایسا نہیں ہو پاتا ہے تو یہ لوگ دنیا کو اور دنیا میں رہنے والوں کو بڑی لمبی زبانوں سے کوستے اور گالیاں دینے لگتے ہیں، اُنھیں گنوار اور مورکھ کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اِن سے یہ ضرور پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر یہ لکھتے ہی کیوں ہیں۔

لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ میں کیسے لکھتا ہوں۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں تو بس ایسے ہی لکھتا ہوں، یعنی جیسے لکھا جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قلم اُٹھا کر کاغذ پر چلانے لگتا ہوں۔ قلم خراب یا ٹوٹا نہیں ہوتا تو چلتا جاتا ہے اور میں اُسے چلاتا جاتا ہوں۔ اکثر قلم روک کر دیکھتا بھی ہوں کہ کیا اور کیسا لکھ رہا ہوں۔ اگر لکھی ہوئی چیز میں کچھ تُک نظر آتا ہے تو مطمئن ہو کر اور لکھتا ہوں اور اگر زیادہ تُک نہیں نظر آتا تو کاغذ قلم الگ پھینک کر چھڑی اُٹھا کر گھومنے چلا جاتا ہوں۔

بہرحال، اشارہ اِس بات کی طرف ہے کہ آدمی کو کرنے کے لئے بہت کام ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اِن میں سے کچھ ہی کام کر سکتے ہیں، بقیہ کام یا تو اُنھیں آتے نہیں یا وہ کرنا نہیں

چاہتے۔ اِس کے علاوہ طبیعت کا بھی سوال ہوتا ہے۔ جب جس کام میں جی لگتا ہے آدمی اُس وقت وہی کام کرتا ہے۔ جسے لکھنا آتا ہے وہ بھی ہر وقت لکھتا ہی نہیں رہتا۔ بلکہ جب جی چاہتا ہے تب ہی لکھتا ہے۔ لکھتے وقت لکھنے کے نتیجہ کو بھی سوچا جاتا ہے۔ اگر اچھا لکھتا ہوتا ہے تو اور لکھتا ہے، ورنہ لکھنا چھوڑ کر کسی اور کام یا تفریح میں لگ جاتا ہے۔ خود میرے ساتھ ایسا اکثر ہوا ہے کہ سڑک پر ٹہلتے ٹہلتے جب اور ٹہلنے میں جی نہ لگا تو گھر آکر لکھنے لگا ہوں۔ کہانیاں عموماً میں نے اِسی طرح لکھی ہیں۔

ویسے جو پہلی کہانی میں نے لکھی وہ تو ایک صاحب سے بازی لگا کر لکھی تھی۔ اُن صاحب کا یہ خیال تھا کہ میں کہانی نہیں لکھ سکتا تھا کیوں کہ اُن کی نظر میں کہانی لکھنے کے لئے ایک قسم کے فطری رجحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالانکہ خیال میرا بھی کچھ اِسی قسم کا تھا لیکن، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مقابلے میں آدمی دریا میں کود پڑتا ہے۔ اِس لئے شام سے میں کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن ایک آدھ جملے کے بعد قلم چلائے نہ چلا۔ سوچتا رہا۔ لیکن سوچتا بھی کیا؟ کچھ ہوتا تب تو

سوچتا کبھی ہیرو، بنوں، کبھی ہیروئن، بن جاؤں لیکن گاڑی
کسی صورت سے آگے نہ بڑھے کھانا کھانے کا وقت آیا۔
لیکن کھانے سے انکار کر دیا۔ بجلی کا لیمپ سرہانے رکھوایا۔
ایک ڈبیہ سگریٹ اور دیاسلائی تکیہ کے پاس رکھے گئے۔ نوکر
کو مکان سے نکال کر باہر کیا۔ پھر دروازے بند کر لئے۔ اِس
طرح شام ہی سے گھر کا چراغ باہر گُل کر کے اندر کہانی لکھنے
بیٹھا۔ اِس کا خیال نہیں رہا کہ کب تک اور کیا لکھتا رہا۔
رات زیادہ باقی نہیں رہی، یہ اُس وقت معلوم ہوا جب میں
اپنی کہانی کے دوران میں صوفا پر ایک کتّا بنا بیٹھا بھونک
رہا تھا اور مجھ سے بہت دور کسی دریہ کی تاریک تنہائی میں
کوئی مُرغ آنکھیں بند کئے بانگ دے رہا تھا۔

لوگوں کا کہنا ہے، بڑھاپے کا شوق بھی بُرا شوق ہوتا
ہے، یعنی ایک بار جب پیدا ہو جاتا ہے تو ختم ہونا نہیں جانتا۔
لیکن وہ بڑھاپا نہیں بلکہ میری جوانی تھی۔ اور جوانی کا شوق
آدمی کو کس کس گھاٹ پانی پلواتا ہے یہ تو آپ جانتے ہی
ہیں۔ چنانچہ جہاں اور مرض پال رکھے تھے وہاں یہ نیا مرض
پیدا ہوا۔ جب دیکھئے کسی نئے افسانہ کے اُدھیڑ بُن میں

لگا ہوں۔ ٹہلنے جاتا ہوں تو جیب میں نوٹ بک لیے۔ جو چیز ذرا عجیب لگتی ہے اُس کے بارے میں اپنا عجیب ذہنی ردّ عمل نوٹ کر لیتا تھا۔

یہ بات ذرا غور کرنے کی ہے۔ افسانوں کے واسطے دنیا اور زندگی کی عام چیزیں بے معنی ہی نہیں بلکہ عام طور سے غیر ضروری ہوتی ہیں۔ صرف غیر معمول چیزیں اکثر دماغ پر اثر کرتی ہیں۔ یا اگر معمولی چیزوں کے بارے میں ذہنی ردّ عمل ہی کسی وجہ سے غیر معمولی ہوتا ہے تو وہ بھی لکھنے والے کے دماغ پر اثر چھوڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ اگر سڑک کے کنارے بہت سے پیڑ اور پودے لگے ہیں اور اُن پر پھول کھلے ہوئے ہیں تو افسانہ لکھنے والے دماغ کے لئے یہ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ لیکن اگر اِس موسم میں سارے پودوں اور درختوں پر پھول نہیں ہیں اور ایک درخت ایسا ہے جس پر پتّیاں نہیں لیکن کسی ننگی ڈالی پر ایک سُرخ رنگ کا بڑا سا پھول لٹک رہا ہے تو اُس پھول نے میرے دماغ کے جیسے تار تار جگا دیئے۔ چند باتیں چنانچہ فوراً دماغ یا ڈائری میں نوٹ کر کے جو گھر لوٹا تو "دسمبر" نام کا افسانہ لکھ ڈالا۔

اگر آپ یہ پوچھیں کہ آیا کہانی لکھنے والوں اور دوسرے آدمیوں میں کوئی فرق ہوتا ہے تو میں زور دے کر کہوں گا، فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے ۔ یعنی اُس سیمر کے پھول کو اگر میرے علاوہ کوئی اور دیکھتا تو اُسے سیمر کی رُوئی کا خیال آتا، اور پھر اُسے اپنا وہ تکیہ یاد آتا جس میں رُوئی اب دب کر بہت کم رہ گئی ہے ۔ لیکن یہ ایک معمولی آدمی کے ذہنی ردِ عمل کی بات ہے، جو اِس دُنیا کو اپنی ضروریات سے الگ رکھ کر سوچ ہی نہیں سکتا۔

لیکن فرض کیجئے کہ اس کے بجائے وہ آدمی کسی قدر Idealist یعنی تصوری ہے ۔ مگر وہ بہت جذباتی یا تصوری ہو کر بھی سیمر کا پیڑ دیکھ کر زیادہ سے زیادہ یہی سوچے گا کہ سڑک کے کنارے ایسے درخت نہیں لگانے چاہیئے جو اِس موسم میں اِس بُری طرح ننگے ہو جاتے ہیں ۔ بلکہ سڑکوں کے کنارے عموماً خوبصورت سر سبز اور شاداب پیڑ پودے ہونا چاہیئے ۔ اِس کے بعد، چونکہ آدمی وہ تصوری ہے، اپنی دماغی دنیا میں وہ سیمر کے پیڑ کو ایک پھول کے بجائے اُسے ہزاروں لاکھوں پھولوں سے لاد دے گا تاکہ درخت

پھولوں سے لدکر اچھا لگنے لگے۔ لیکن افسانہ نگار ہونے کے سبب سے میرا سر چونکہ زیادہ پھرا ہوا تھا اس لئے اُس ننگے سیمر کے درخت میں مَیں نے اپنے پورے سماج کو دیکھا اور اس اکیلے سُرخ پھُول کی سُرخی میں اَن گِنت آدمیوں کا خون دیکھ کر ایک ترقی پسند ادیب بن بیٹھا۔ اور اگر میں ترقی پسند ادیب نہ ہوتا تو ایسا کچھ نہ سوچتا۔ بلکہ اُس پھول کو اپنے معشوق سے مشابہ پاکر نثر کی زبان میں شاعری کرتا اور اِس طرح آتما اور پرماتما کو ملاکر ایک کہانی لکھ کر تیّار کر دیتا۔

منشی پریم چند سے ایک بار ناول نگار پر بولنے کے لئے کہا گیا۔ چونکہ ہوسٹل میں اُس وقت میں بھی رہتا تھا اِس لئے اُن کی تقریر سُننے کا موقع مجھے بھی ملا۔ لیکن منشی جی کی زبان سے جب میں نے یہ سُنا کہ ناول لکھنے والے کو ایک حد تک آوارہ یعنی Vagabond بھی ہونا چاہیئے تو مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے سوچا کہ شاید منشی جی مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن آج جب پریم چند کی اُس بات کو سوچتا ہوں تو تعجب اِس پر ہوتا ہے کہ آخر اُس آسانی سے کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے وہ۔ دراصل ناول یا کہانی لکھنے کے لئے آدمی کی طبیعت میں

تھوڑی آوارگی نہایت ضروری ہے۔ ذہنی آوارگی تو آرٹ کے کسی بھی شعبہ میں کمال حاصل کرنے کے لئے، چاہے وہ شاعری ہو یا مصوّری یا کوئی اور فن ہو، لازم ہے۔ لیکن ناول یا کہانی لکھنے والے کے لئے اِس ذہنی آوارگی کے علاوہ خود اُس کی زندگی میں آوارگی کا تجربہ ایک حد تک ضروری ہوتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اگر یہ طبیعت اور ذہن کی آوارگی آدمی میں نہ ہو تو ایسی بے ڈھنگی اور غیر ضروری چیزوں سے وہ دلچسپی لے ہی کیوں۔ محنت اور ایمانداری یا غیر ایمانداری سے پیسہ کما کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا ہی کیا کم ضروری کام تھے زندگی کے لئے؟ زمین پر رہتے ہوئے دو پنکھ باندھ کر انسانی زندگی کی حدود سے باہر اُڑنا زمین کی زندگی کامیاب بنانے کے لئے ضروری نہیں۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ آوارہ نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے دُنیا کی نظروں میں؟ لیکن جہاں دوسرے آرٹ کے لئے یہ ذہنی آوارگی ہی کافی ہو سکتی ہے، وہاں ناول اور کہانی کے لئے آوارگی زندگی میں بطور ذاتی تجربے کے ضروری ہوتی ہے۔

بہرحال خود اپنی کہانی سُناتے ہوئے مجھے یہ بتانا ہے کہ

یہ شوق یا بدشوقی جوں جوں بڑھتی گئی میری ادبی سرگرمی بھی اُس کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ایک کے بعد دوسری، کہانیوں پر کہانیاں میں نے لکھیں۔ لکھنے سے بھی زیادہ پڑھتا تھا۔ جتنا ہی زیادہ پڑھتا اُتنا ہی اپنی لکھی ہوئی چیز ہیچ، بے جان اور نامکمل لگتی۔ جتنا ہی لکھتا اُتنا ہی لکھنے کی مشق بڑھتی تھی اور قلم میں طاقت اور روانی آتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر دس جملے لکھ کر پانچ جملے تک کاٹ دینے پڑتے تھے۔

بہر حال اِس لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے سے سمجھ میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ بلکہ ہر چیز اب ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کی جیسے عادت سی ہوگئی۔ رہنا اسی دنیا میں پہلے بھی تھا۔ لیکن وہی دنیا اب جیسے مجھے بدلی بدلی سی لگنے لگی۔ دُکھ سُکھ پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں، لیکن پہلے اور اب کے دُکھ سُکھ میں جیسے بڑا فرق معلوم ہوتا ہے مجھے۔ کہانیوں میں دُکھ سُکھ کے نقشے کھینچتے کھینچتے اپنے دُکھ سُکھ کھلونوں جیسے لگنے لگے۔ کسی لکھنے والے کے لئے میں یہ سب سے بڑا اور ضروری تجربہ سمجھتا ہوں۔ چند ناول اور کہانیاں لکھ کر کچھ پیسے یا نام کما لینا ایک چیز ہے۔ لیکن اِس لکھنے سے اگر لکھنے

والے کی ذہنی اور روحانی ترقی ہوتی نظر نہیں آتی، جس طرح
میں نے بیان کیا ہے، تو بہتر ہو گا اگر وہ لکھنے والا کاغذ قلم
پھینک کر کچھ اور نہیں تو گھاس ہی کھود دے۔
سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ میں کیسے لکھتا ہوں۔ بہت لوگ
لکھنے سے پہلے افسانے کا ایک ڈھانچہ بنا لیتے ہیں اور پھر اُسی
ڈھانچہ کے سہارے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ کچھ ایسے لکھنے
والے بھی ہیں جو دیکھے یا سُنے ہوئے واقعات کی بنا پر، جگہوں
اور لوگوں کے نام بدل کر، کہانیاں تیار کر لیتے ہیں۔ میری
عادت یہ نہیں، اور شاید اسی وجہ سے میرے افسانوں میں
عموماً کوئی 'پلاٹ' نہیں ہوتا۔ میں عام طور سے جب کوئی چیز
دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہوں تب ہی اُس اثر کے ماتحت،
کہانی لکھتا ہوں۔
مثال کے طور پر آپ کو اپنی ایک آپ بیتی سُناؤں۔
دو تین سال کا واقعہ ہے۔ رات اندھیری تھی۔ میں کہیں سے
ٹہل کر لوٹ رہا تھا۔ اِس طرف سے ایک ٹھیلہ جا رہا تھا۔
چونکہ ٹھیلہ خالی تھا اِس لئے صرف دو آدمی اُسے پیچھے سے
دھکا دیتے لئے جا رہے تھے۔ تیسرا آدمی ٹھیلہ پر، اپنا بدن

انگوچھے سے ڈھکے، اپنی گود میں ایک چراغ چھپائے ہوئے بیٹھا تھا۔ انگوچھا چراغ کو ہوا کے جھونکے سے بچاتا تھا۔ مزدور اپنی گود میں چراغ چھپائے اسی طرح چراغ کا سہارا بنا ہوا تھا جیسے کوئی چراغ دان یا ڈیوٹ چراغ کی جلتی ہوئی روشنی کا سہارا ہوتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اس لئے کہ وہ ہوائی حملے کا زمانہ تھا۔ لیکن پھر بھی پولیس سے بچنے کے لئے ٹھیلہ پر بتی ضروری تھی۔ انگوچھا چراغ کے گرد ہوائی حملے سے بچاؤ، کا بھی کام کر رہا تھا۔

جب میں نے اس پوری چیز پر غور کیا تو جیسے سرمایہ داری نظام کا پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ صرف مزدور کے ہاتھ میں چراغ جل رہا تھا۔ چنانچہ گھر لوٹ کر میں نے ایک کہانی لکھنی شروع کی، جس کا نام رکھا "بلیک آؤٹ"۔ لڑائی ختم بھی ہوگئی لیکن میری وہ کہانی ختم نہ ہوسکی۔

جس طرح آدمی الگ الگ ڈھنگ اور طبیعت کے ہوتے ہیں اسی طرح ان کے لکھنے کے ڈھنگ بھی الگ ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی ایک

طریقہ صحیح ہے اور بقیہ سب غلط ہیں۔ پھر بھی خود اپنے تجربوں
کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے،
اور آدمی جتنا زیادہ لکھتا ہے اتنا اچھا لکھنے کا وہ امکان رکھتا
ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ لکھا جائے اُسے
چھپا ہی دیا جائے۔ روٹی کی مجبوری انسان سے جو نہ کرالے،
ورنہ میں خود کسی چیز کو بہت انتظار کر کے اور اُسے
بار بار دوہرا کر اور صاف کر کے چھپانے کا قائل ہوں۔
کچھ لوگ بہت کم عمر میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں میں نے
خود شاید ۲۷ یا ۲۸ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ ایسی
حالت میں کوئی بات زور دے کر میں نہیں کہہ سکتا۔ پھر بھی
میرا ایسا خیال ہے کہ لکھنا جہاں تک ہو سکے کم عمر میں نہ شروع
کرنا چاہیئے۔ خاص طور سے کہانی اور ناول کے لئے دل اور
دماغ اور تجربہ کی پختگی کی بہت ضرورت ہوتی ہے —
جس طرح اینٹ آگ میں پکتی ہے اُس طرح آدمی جب
زندگی کی آگ میں سال بہ سال تپتا ہے تب اُس کی
آنکھوں اور دماغ میں وہ روشنی آتی ہے جو اُس کو چیزوں
اور آدمیوں کو دیکھنے اور پہچاننے کی وہ قوت دیتی ہے جس کی

مدد سے وہ کوئی بڑی چیز لکھ سکتا ہے۔

علاوہ اور چیزوں کے، لکھنے والے کو ایماندار بھی ہونا چاہیئے۔ یہ ایمان داری جگ اور جیون کو دیکھنے اور سمجھنے میں برتنا چاہیئے، اُن کے بارے میں لکھتے وقت برتنا چاہیئے اور خود اپنے ساتھ برتنا چاہیئے۔ جس آرٹ کی خصوصیت ایمانداری یا خلوص نہیں ہے وہ بڑا آرٹ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایمانداری کے علاوہ ہمدردی دوسری خصوصیت ہے جو کسی بڑے فن کار میں ہونی ضروری ہے۔ اگر پریم چند آج کے سارے لکھنے والوں پر بھاری پڑتے ہیں تو اُس کی خاص وجہ یہ ہے کہ پریم چند کو دنیا اور زندگی سے خلوص، محبت اور احترام کے علاوہ ہمدردی تھی۔ یہ خوبیاں آج کے لکھنے والوں میں مجھے نہیں ملتیں اور خود مجھ میں تو بالکل نہیں۔ ایسی حالت میں لکھتا کیا بس خاک چھانتا ہوں، یا یہ کہیئے کہ جینے کا بہانہ ڈھونڈھتا ہوں۔

دعوتِ نظر

اوناش نے آج زبان تو کھولی لیکن دل کھولتے وقت سنکوچ کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی اندرونی شرم سے اُس کی آنکھیں جُھکی جاتی تھیں۔ اُسے میں نے زیادہ ہنستے بولتے تو کبھی بھی نہ پایا تھا۔ لیکن اُسے اِتنا سنجیدہ اور غمگین بھی شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔

اوناش جب چُپ رہا تو مجھے چُپ رہنا ہی تھا لیکن مَیں نے جب دیکھا کہ اپنے سے وہ اور کچھ ہرگز نہ کہے گا تو میں نے ہی اُس سے پوچھا" تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری اُس سے ملاقات کیسے ہوئی"

اُس نے آنکھیں اوپر کرکے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچا کر لیا۔ آہستہ آہستہ اپنی بات وہ کہتا جا رہا تھا اور میں سُنتا جاتا تھا۔ مجھ پر پورے ماحول کا جادو جیسا اثر ہو رہا تھا۔ مَیں

سمجھتا تھا جیسے میرے ہی اندر سے کوئی بول رہا ہے۔ کبھی یہ بھی شُبہہ ہوتا کہ آواز کہیں اوپر سے آ رہی ہے ۔۔۔

ہولی کی چھٹیوں میں عام طور سے میں گھر نہیں جاتا تھا۔ ہوسٹل میں رہ کر بھی میں لڑکوں کے ساتھ ہولی وغیرہ نہیں کھیلتا تھا۔ ہولی کے دن ہوسٹل اور کالج کی دُنیا سے دُور جا کر میں آزاد پارک میں اُس سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا، جو ۵۸ء میں مرے ہوئے گورے سپاہی کی مزار پر آج بھی رکھوالی کر رہا ہے۔ ہاتھ میں کوئی کتاب لئے اُس سرو اور دوسرے درختوں کے سایہ میں بیٹھا بیٹھا اِس طرح ہولی کا دن گزار دیتا۔ ہوسٹل شام کو اُسی وقت لوٹتا جب ہولی کا ہُلّڑ ختم ہو گیا ہوتا۔

محض اتفاق تھا جو پچھلے سال ہولی کے موقع پر گھر میں گیا۔ اور یہ بھی صرف اتفاق ہی کا کھیل تھا جو اُس وقت وہ میرے وہاں موجود تھی۔

والد اُس کے زمیندار تھے۔ مگر دیہات میں رہتے ہوئے بھی اُنھوں نے گھر پر پڑھا کر اُسے مڈل تک کی ہندی اور اُردو کی قابلیت کرا دی تھی۔ لیکن چونکہ اب اُس کی عمر ایسی

تھی کہ شادی کا سوال جلد ہی پیدا ہوتا اِس لیئے ماں نے سوچا شادی سے پہلے اگر لڑکی کچھ دنوں شہر میں رہ کر شہری زندگی کے رُوپ رنگ سے بھی واقف ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔ ویسے اُس سے پہلے وہ شہر اکثر آتی گئی تھی۔ لیکن اب چونکہ شادی کا سوال تھا اِس لیئے سلائی وغیرہ سیکھنے کے خیال سے اُس کے گھر والوں نے خاص طور سے کچھ دِنوں کے لیئے میرے بھائی صاحب کے وہاں بھیجا، جو اُس کی ماں کی وجہ سے سسرال کے ناتے سے بہت نزدیک کے رشتہ دار ہوتے تھے۔

وہ دیہات میں رہتی ضرور تھی۔ لیکن اُسے کسی صورت سے دیہاتی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ میں نے تو یہ دیکھا کہ دیہات میں رہتے ہوئے شہری زندگی کا احساس جتنا اُسے تھا اُتنا شہر میں رہنے والی لڑکیاں اپنی شہری زندگی سے متاثر نہیں تھیں۔ پہننے اوڑھنے میں وہ جس احتیاط اور ارادی نفاست سے کام لیتی تھی اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اِس کا اُسے بہت خیال رہتا تھا کہ شہر میں رہکر شاید اِن مصنوعی پہلوؤں پر خاص دھیان دینا چاہیئے۔ رنگ اُس کا گورا تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اُس کے گالوں کی ہلکی گلابی کا اثر چہرے پر ایسا پڑتا تھا کہ دیکھ کر اُسے کوئی

سانولا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ خاص طور سے اُس کا ہنستا سب
کو اچھا لگتا تھا، کیونکہ ہنستے وقت اُس کی آنکھیں بھی جیسے
مسکرا تی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بڑی پڑی چنچل چکور
جیسی اُس کی آنکھیں ویسے ہی ناچا اور مسکرایا کرتی تھیں
جیسے وہ خود جہاں رہتی ناچتی اور مسکراتی پھرتی تھی۔

معلوم نہیں کیوں شروع ہی سے وہ مجھ سے دلچسپی رکھنے لگی۔
میں نے سوچا کہ شاید ایک دو دن بعد جب اوروں کی طرح وہ بھی
مجھ سے مانوس ہو جائے گی تو میرے واسطے اُس کا استعجاب آپ سے
آپ ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ پیٹھ پیچھے گھر کی
دوسری لڑکیوں سے میری تعریف کرنا جیسے اُس کی عادت سی
ہو گئی تھی تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔ جہاں تک میرا سوال
تھا، میں یوں بھی لڑکیوں سے بہت گھبراتا تھا۔ لیکن جب
مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ پر خاص طور سے مہربان ہے تب
تو اُس کے سامنے آنکھیں اُٹھائے نہ اُٹھیں۔ جب میں اوروں
کے ساتھ بیٹھا ہوں اور وہ بھی اُس وقت وہاں آجائے تو میں
ایسا محسوس کروں کہ جیسے شرم کے مارے میں زمین میں گڑا
جا رہا ہوں۔ لیکن میرے لئے جو پریشانی کی چیز تھی وہ یہ کہ میرے

منہ سے کوئی بات نکلی نہیں کہ وہ اُسے پوری کر دیتی تھی۔ اور اگر میں جلدی میں بات پوری بھی کہہ جاؤں تو اُس کی تائید کرنا یا ہاں میں ہاں ملانا جیسے اُس کی دوسری ڈیوٹی تھی۔ گھر کی دوسری لڑکیاں اُس کی اِن حرکتوں کی وجہ سے میرا اور اُس کا دونوں کا مذاق اُڑائیں۔ میں ایسا محسوس کروں کہ پوری بوچھار میرے ہی اوپر ہے۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی قدرتی طور پر کسی قدر لازمی تھی۔ اِس وجہ سے کہ اُس کی اُن حرکتوں سے میں ایسا محسوس کروں کہ گھر والے شاید یہ سوچتے ہوں کہ اُس کے اَلھڑ پن اور شوخی کا کارن میں ہی تھا۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اُس کی ساری ہمدردی اور بیباکی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے نہایت ہی سیدھا سادا اور شرمیلا انسان سمجھتی تھی تو اپنے بارے میں اُس کی اُس تشخیص کو سُن کر اور پشیمان ہوا، اور اندر ہی اندر سخت کُڑھن ہوئی۔ میں خود لنگڑا یا اندھا ہوں اور دوسرا کوئی میرے لئے اندھے کی لاٹھی بننا چاہتا ہے، یہ احساس کسے اچھا لگتا۔ کون نہیں چاہے گا کہ کوئی اُس کی خوبیوں کو چاہے۔ لیکن سیدھا یا بُدھو پن کر کسی کی ہمدردی کا محتاج بنتا کون پسند کرے گا۔ چنانچہ اِس طرح میں اُس کے اور دوسروں کے

لئے تماشہ بن کر رہ گیا۔ اور جلد ہی مجھے پوری چیز سے کوفت اور پریشانی ہونے لگی۔

بہرحال ابھی مشکل سے دو یا ڈھائی دن گھر پر رہا تھا کہ ایک دوپہر کو وہ میرے کمرہ میں چلی آئی۔ میں یونہی چارپائی پر پڑا سوچ رہا تھا۔ اُدھر جب دھیان گیا تو دیکھا وہ سرہانے کھڑی ہے۔ جیسی اُس کی عادت تھی، کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے تو یا مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اُس کی نگاہوں کی مار سے بچوں تب تو کوئی صورت نکالوں لیکن وہ کاہے کو مانتی۔ مستقل کھڑی مسکراتی رہی۔ مگر میں اُس بیچارگی کی حالت میں آخر کب تک پڑا رہتا۔ چنانچہ جب میری آنکھیں بھی اُلٹ کر اُسی کو دیکھنے لگیں تو اُس کی نگاہیں مروّت یا حیا سے نیچی ہو گئیں۔ جب میں سنبھل کر پلنگ پر اُٹھ بیٹھا تو دیکھا اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کاپی بھی ہے۔ اب تو اُس حالت میں اُس کا وہاں ہونا میرے واسطے ایک نہ حل ہونے والی پہیلی ہو گئی۔ مارے پریشانی اور گھبراہٹ کے میں لال ہوا جا رہا تھا۔ بدن اندر ہی اندر ایسا کانپ رہا تھا کہ جیسے جوڑی آنے

والی ہو۔ لیکن جب اِس طرح اُس نے جی بھر کے مجھے ذلیل کر لیا تو خود ہی مسکرا کر پلنگ کی پٹّی پر مجھ سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کو تو میرے پاس پلنگ پر بیٹھی تھی لیکن پاس بیٹھ کر بھی مجھ سے جو دوری نبھا رہی تھی اُس سے مجھے اور خلش ہونے لگی۔ آخر میں ذات کے باہر تو تھا نہیں جو مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جاتا۔ گھر میں دوسری لڑکیاں بھی تو تھیں لیکن میرے پاس بیٹھ کر اور تو کوئی اس طرح ذلیل مجھے نہیں کرتا تھا۔

لیکن ابھی کیا۔ اصل کہانی اب شروع ہونے کو تھی۔ معلوم ہوا کہ اُسکی مرضی سے یا گھر میں کسی اور کے کہنے سے میں اُس کا انگریزی کا ماسٹر چُنا گیا تھا۔ چنانچہ یہ معلوم کرتے ہی مجھے تو وہ ساری کہانیاں یاد آنے لگیں جو شروع ہوتی ہیں کسی یتیم لڑکے سے اور ختم ہوتی ہیں کسی امیر گھر کی لڑکی سے شادی ہو کر، جس کو پڑھانے کے لئے اصل میں وہ ماسٹر رکھا گیا تھا۔

اُس کا پڑھانا خود میرے لئے ایک بڑا امتحان تھا۔ ویسے کہاں کا ماسٹر تھا جو میں کسی کو بھی پڑھا سکتا۔ پھر

رومن، حروف میں لفافوں پر پتہ لکھنے والی شباب کی سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی سِن رسیدہ لڑکی کو انگریزی پڑھانا کسی کے لئے بھی کیا آسان کام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بڑی بڑی شوخ آنکھیں اُٹھا کر کسی لفظ کا مطلب پوچھتی تو میری آنکھیں ایسی لڑکھڑاتیں کہ سنبھالتے سنبھالتے بھی میں کہاں سے کہاں جا کر گرتا۔ پھر میں سوچتا، خاک میں ملے ایسی پڑھائی جو ہر منٹ مجھے ہی اِس طرح فیل پاس کئے دیتی ہے۔ اور جب اپنی نرم کومل اُنگلی کسی لفظ پر رکھ کر وہ پڑھنے کی کوشش کرتی تو ہکلا کر میرا ہی تلفّظ گڑبڑا جاتا، اُس کا تلفظ کہاں سے درست کرتا۔

بہر حال وہ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ثابت ہوا۔ وہ گھر میں جا کر رپورٹ کرتی۔ معلوم نہیں بھائی صاحب کیوں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ پھر میری سیدھائی اور اِس لئے اچھائی کی تعریفیں کرنے لگتی۔ چنانچہ جب ایک دن ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر اندر کی یہ داستان میں نے سُنی تو سوچا خیریت اسی میں ہے کہ اب یہاں سے بھاگ چلو۔ ورنہ یہ ماسٹری تو مٹا کر ہی چھوڑیگی۔

یونیورسٹی میں چونکہ اور درجوں کے امتحان ہو رہے تھے اِس لئے ہولی کی چھٹی ختم ہو جانے کے باوجود بھی گھر پر ٹھہر گیا تھا۔ سوچا وہاں بھی جا کر ایسی پڑھائی لکھائی تو ہو گی نہیں، اِس لئے بہتر ہو گا ایک ہفتہ گھر پر ہی رہ کر پڑھوں۔ لیکن پڑھائی کہاں سے ہوتی، یہاں تو ماسٹری ہو رہی تھی۔ اِس لئے طے کیا کہ اب یہاں سے چل دوں۔

گھر والوں کو دوسرے ہی دن اِس کی اطلاع دے دی۔ اس کا اثر اُس پر عجیب ہوا۔ پہلے تو کچھ اُداس سی نظر آئی۔ پھر جو میری خدمت پر اُتر آئی تو دوسرے میرے نزدیک پھٹکنے بھی نہ پائیں۔ اندر پہونچا نہیں کہ میرا کھانا نکالنے رسوئی میں پہنچ گئی۔ ایک دن ایسے ہی جب میں چوکے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو وہ مٹّی سے پوتی ہوئی گیلی نرم زمین پر چمچے سے کچھ لکھنے لگی۔ لیکن جوں ہی میں نے اُس طرف دیکھنے کو آنکھیں اُٹھائیں اُس نے چمچے سے عبارت مٹا دی۔ بس اتنا دیکھ پایا کہ میرے نام کا پہلا حصّہ ابھی لکھا جا سکا تھا کہ اُسے فوراً اُسی چمچے سے کُرید کر صاف کر دیا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ تصوّر اچھّا لگا کہ وہ

بیٹھے بیٹھے میرا نام لکھا کرتی ہے۔ لیکن جو چیز اچھی نہیں لگی وہ اُس کا اِس سہولت سے میرا نام مٹانا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اُس طرح اپنا نام و نشان مٹنے کا قلق اور دکھ بہت دنوں تک رہتا اگر اُسی دن شام کو برآمدہ میں سے گذرتے وقت اتفاق سے میں نے غسل خانہ میں اُس کا گنگنانا نہ سُن لیا ہوتا ؎

کھیل اُس کمسن نے کھیلا نام لیکر میرا
ہاتھ سے تُربت بنائی پیر سے برباد کی

تب میں نے سمجھا کہ وہ کمسن کا کھیل تھا اور وہ میری تُربت تھی جو بنا کر اس طرح برباد کی جا رہی تھی۔ اور وہ بھی اُس کے لئے کھیل ہی تھا جو اُس دن دوپہر کو، جب میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹا تھا، وہ دو بیڑے پان لے کر آئی اور اُنھیں اچانک میرے منہ میں رکھ دیا۔ میں نے بیڑوں کو دانتوں تلے دبائے نہیں کہ کٹے ہوئے پان گھسیٹ لے گئی۔ جس وقت میں بچے ہوئے بیڑوں کو منھ میں زبان سے سنبھال رہا تھا تو وہ کٹے ہوئے پانوں کو اپنے مُنہ میں ڈالتی ہوئی ہنس کر کمرہ کے

باہر نکل گئی۔

اتنی بات کہہ کر اونیاش چپ ہو گیا۔ مجھ سے بھی اب کچھ بولتے نہ بنے بند کمرہ میں صرف خاموشی کی لہریں تیر رہی تھیں۔ اونیاش کی آنکھیں اب بھی نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں میں حیرت کر رہا تھا، میں نے اونیاش کو کیا سمجھ رکھا تھا اور دراصل وہ کیا نکلا۔ اُسے اِس نئی روشنی میں دیکھ کر میں یہی سوچ رہا تھا کہ آدمی کی زندگی کے بھی کیا کیا پہلو ہوتے ہیں۔ میں نے اُسے کیا سمجھا تھا اور کیا پایا۔ یہ سوچتے سوچتے جیسے میری شخصیت گھٹتی جا رہی تھی اور کمرہ کی خاموش فضا میں چھوٹی ہو کر جیسے کھوئی جا رہی تھی۔ جب اونیاش اپنی کہانی سنا رہا تھا تو میں اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ کیا وہ سب سچ تھا جو وہ سُنا رہا تھا۔ اور جب وہ کہانی ختم ہو چکی تھی تو میں بیٹھا تعجب کر رہا تھا کہ اونیاش اپنے دل پر اتنا بڑا بوجھ کیسے لئے پھرتا ہے۔ پھر خاموشی سے چونک کر میں نے پوچھا۔ "تب کیا ہوا؟"

آنکھیں فرش پر گڑائے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ "رات کی گاڑی سے میں آنے والا تھا۔ چلنے سے پہلے ایک لمحہ

کے لئے وہ میرے پاس آئی تھی۔ اُس نے کہا۔ "آپ جا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "ہاں"۔ چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے جیسے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو، اُس نے پوچھا۔ "پھر کب؟ ــــ" میرے منہ سے لفظ "شاید" سُننے سے پہلے وہ ایک دم چل دی اور آنچل سے منہ پونچھتے پونچھتے کمرہ کے باہر نکل گئی۔"

میں پتھر کی مورت کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا ــــ کون کہاں رہتا ہے! کون کس کا ہونا ہے!! اوبناش کی دُکھ بھری کہانی سُنتے سُنتے میرا جی بھر آیا۔ لیکن اُس کے سنجیدہ مزاج کو جانتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ درد کی اُس کیفیت کو اُس کے اوپر دیر تک قائم رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اُس کا جی ہلکا کرنے کے لئے میں ہنسنے لگا۔ جیسی اُس کی عادت تھی، جھینپ کر وہ بھی ہنسنے لگا لیکن میں چونکہ اُس کی طبیعت سے واقف تھا اِس لئے میں نے سوچا کہ وہ اتنا جلد اُس اثر سے نہیں چھوٹ سکے گا۔ چنانچہ اُس کی طبیعت بہلانے کے لئے میں نے کہا۔ "اِن باتوں میں کیا رکھا ہے یار۔ ایسا تو سب ہی

کے ساتھ کبھی نہ کبھی ہوتا ہے۔ میں تو آدمی کی زندگی کے لئے یہ بھی ایک ضروری کھیل سمجھتا ہوں۔ بالکل ایسا ہی میرے ساتھ بھی ایک واقعہ گزرا تھا۔ تم سنو گے تو تم بھی کہو گے کہ ہاں۔

جاڑوں میں بڑے دن کی چھٹیاں شروع ہوئی تھیں۔ میں گھر جا رہا تھا۔ وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا۔ انٹر کلاس میں ایک طرف بستر لگا کر لیٹ رہا۔ سامنے والی 'برتھ' پر ایک مارواڑی اپنا بستر لگائے تھا۔ اتنے میں ایک بھلے آدمی بال بچّوں کے ساتھ ڈبّے میں داخل ہوئے۔ دونوں دروازوں کے بیچ میں جو 'برتھ' تھی وہی خالی تھی چنانچہ وہ اور اُن کی بیوی، جو دیکھنے میں اُن سے عمر میں بڑی لگتی تھیں، اُسی برتھ پر قابض ہو گئے۔ سامان اندر آنے کے بعد سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی بھی چھوٹی بہن کو اُنگلی پکڑائے اندر آئی۔ اُن دونوں کے علاوہ ماں کی گود میں بھی ایک بچّہ تھا۔ لیکن مسافروں سے بھی زیادہ اُن کا سامان تھا، جسے قلیوں نے دیکھتے دیکھتے ڈبّے میں نیچے اُوپر بھر کر جیسے ڈبّہ کو سجا دیا۔ جب سامان رکھا جا چکا تو

بیٹھنے کا سوال پیدا ہوا۔ میاں بیوی اُسی دبرتھ، پر بیٹھ
گئے، اور اُن کے ساتھ اُن کی بڑی لڑکی بھی۔ چھوٹی
لڑکی جس کی عمر شاید چھ سات سال رہی ہو گی، بیچ میں
کھڑی رہ گئی تھی۔ اِس لئے میں نے اُسے اپنے پیر کے
پاس جو جگہ خالی تھی اُس پر بیٹھ جانے کو اشارہ کیا۔
یوں شاید وہ میرے پاس نہ بیٹھی کیونکہ میرے کہنے
کے باوجود بھی ہچکچا رہی تھی۔ لیکن اُسی وقت بڑی بہن
کا اشارہ پاکر وہ میرے پیر کے پاس پھاٹک سے ٹیک
کر بیٹھ گئی۔ ابھی اُن لوگوں کا بستر وغیرہ لگ ہی رہا
تھا کہ گاڑی چلنے لگی۔

ٹرین کے سفر کے مزے اُسی کو ملتے ہیں جس کو کم سے
کم لیٹنے کی جگہ نصیب ہو۔ جیسا کہ میری سفر میں عادت
ہے، میں نے سگریٹ جلائی، ڈبیہ سرہانے رکھی اور تکیہ
کے نیچے سے ناول نکال کر پڑھنے لگا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا
کہ بالکل پڑھتا ہی رہا کیونکہ اگر صرف پڑھنے ہی میں لگ
گیا ہوتا تو یہ کیسے بتا سکتا کہ ڈبہ میں اور کیا کیا ہو رہا تھا۔
ایسے ماحول میں پڑھنے پاتا بھی کیسے، جہاں علاوہ اور

خلل اور ہنگاموں کے اَن پڑھ مارواڑی کی مستقل بکواس مارے ڈال رہی تھی۔ لیکن جب ہاتھ میں کتاب لے کر پڑھنا شروع کر دیا تھا تو پھر اُسے کس بہانے اُٹھا کر رکھ دیتا۔ چنانچہ نہ پڑھتے ہوئے بھی اُسے کسی طرح پڑھتا رہا یہ تو جب بالکل کتاب اُٹھا کر ڈال ہی دیا تب معلوم ہوا کہ اُس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ کوئی اور بھی پڑھ رہا تھا۔ اور کمبخت مارواڑی اُس وقت اُس بھلے آدمی سے یہاں تک پوچھ چکا تھا کہ لڑکی کس درجہ میں پڑھتی ہے، چھوٹی لڑکی نے ابھی پڑھنا شروع کیا یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اُس کے لئے اتنا کافی نہ تھا کہ وہ کون تھے، کہاں رہتے تھے، اور کہاں جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جاہل، جسے خود پڑھائی لکھائی سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، سب کی پڑھائی ہی کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ میری پڑھائی لکھائی تو مجھے اس کی اجازت دیتی نہ تھی کہ اِس طرح انجان آدمیوں کی بات چیت میں حِصّہ لینے لگتا۔ بلکہ بغیر جان پہچان کے لوگوں سے بات چیت کرنے کو میں صرف حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مگر میری پریشانی کا پارہ سب سے زیادہ

اونچائی پر اُس وقت پہونچا جب میں نے سُنا کہ مارواڑی باتوں کے سلسلہ میں یہ بھی بے مانگی رائے دیئے دے رہا تھا کہ جج صاحب کو بہت جلد اپنی لڑکی کی شادی کے مسئلہ کو بھی حل کرنا پڑے گا۔ اُس وقت جو میں نے نظریں بچا کر جھانک کر دیکھا تو شادی ہونے والی کا پورا چہرہ ہندی رسالہ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

مارواڑی کی زبان سے لڑکی کی شادی کا ذکر سُن کر تو جیسے میں اپنی ساری خوشی ہی کھو بیٹھا۔ لڑکی کو بھی وہ باتیں کیا پسند آتیں۔ چنانچہ اُس نے شاید شرم کی وجہ سے اپنا مُنہ کھڑکی کے باہر کر لیا۔ مجھ سے بھی چونکہ مارواڑی کی باتیں نہ سُنی جا رہی تھیں اِس لئے میں بھی اپنی گردن نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ وہ کام اچھا نہیں ہوا تھا اس کا احساس تو لڑکی کی نظر سے نظر مل کر ہوا۔ لیکن گاڑی میں ہم دونوں ایک ہی طرف بیٹھے تھے اِس لئے کرتے بھی تو کیا کرتے۔ جب بھی ڈبہ کے باہر سر نکال لیتے تو نگاہوں کے ملنے کے خطرہ کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن پھر بھی اُس وقت نگاہیں ایک ہو جانے کے بعد تو گھبراہٹ میں سر اندر کر ہی لینا پڑا۔

لیکن لڑکی کی آنکھوں سے بچنے کے لئے جو سر اندر کیا تو
مارواڑی کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ مگر
جھنجھلاہٹ میں جو اُس کی طرف سے مُنہ موڑنا چاہا تو
میری تو جیسے شامت ہی آگئی۔ چنانچہ جب اُس نے مجھ سے
پوچھا" بابو جی، آپ کیا کرتے ہیں؟" تو مجھے اتنا بُرا لگا کہ
میں اُس کے سوال کا جواب بھی نہ دیتا اگر اُسی وقت میری
جج صاحب اور اُن کی بی بی کی نظریں ایک دوسرے سے
ٹکرا نہ گئی ہوتیں۔ مجبوراً عدالت میں ملزم کی طرح پھر میں
نے سب کچھ بتا دیا۔

اُس کے بعد مارواڑی نے بیڑی جلا کر میرے اور میرے
خاندان اور گھر کے بارے میں جو جرح شروع کی وہ تو مجھے
ننگا کر کے ہی چھوڑتی۔ اگر اُسی وقت یہ جان کر کہ میں ایک
بھلے کالستھ گھر کا لڑکا تھا اور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا
پڑھے لکھے روشن خیال جج صاحب نے میری جان نہ
بچائی ہوتی۔ میری پریشانی کو بھانپتے ہوئے اُنھوں نے
بات ایسی بدل دی کہ بات کسی طرح اُس وقت ٹل ہی
گئی۔ لیکن مارواڑی بھی کوئی ایسا ویسا آدمی تو تھا نہیں۔

چنانچہ وہ بھی اپنا آخری داؤں چل کر ہی مانا۔ اُس نے جب جج صاحب کے کنبہ کی دلچسپی مجھ میں بڑھتی دیکھی تو آنکھیں گھوما کر ایک ہی نظر سے مجھے، جج صاحب، اُن کی بی بی اور اُس لڑکی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "تو آپ لوگ تو ایک ہی ہیں" جج صاحب تعلیم اور تہذیب کے آدمی تھے ورنہ مارواڑی نے تو ہماری اور اُس کی شادی بھی وہیں اُسی ڈبہ میں کرا دی ہوتی۔

اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بیچاری اب مجھ سے ضرورت سے زیادہ شرمانے لگی۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا جج صاحب اپنی پڑھائی کے زمانے کی یاد تازہ کرنے لگے۔ پڑھنے لکھنے اور کالج یونیورسٹی کی بات چھڑ جانے سے مارواڑی کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ سرِشام ہی کمبل سے منھ ڈھک کر سو رہا۔ اِدھر ہم لوگ اچھی خاصی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ جج صاحب کی بی بی بھی شوہر کی پڑھائی کے دنوں کی داستان سُن کر من ہی من خوش ہو رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے کھسکتا کھسکتا اُن اُن لوگوں کے بہت نزدیک پہنچ گیا تھا۔ باتیں ہم لوگ ایسے

کر رہے تھے کہ جیسے پرانے ملاقاتی ہوں۔ اس درمیان میں مارواڑی کے خاموش ہو جانے کے بعد اب اُس کی ناک اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔

ہم لوگ دیر تک ہنستے اور باتیں کرتے رہے۔ اور اگر باتیں نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ڈبّہ میں اتنی جگہ تو تھی نہیں کہ مارواڑی کی طرح جج صاحب کے گھر والے بھی شام ہی سے پڑ کر سو رہتے۔ اور اُن کے جاگتے ہوئے مجھے کیسے نیند آتی۔ جلد نیند آنے کی جن کی عمر تھی وہ تو سو ہی گئے تھے۔ جج صاحب کے دونوں چھوٹے بچے اور ڈھلتی ہوئی عمر کا مارواڑی۔ لیکن اُس ظالم نے سو کر اور مر کر بھی ہم لوگوں کو چین نہ لینے دیا۔ اُس کی ناک کی آواز اب دھیرے دھیرے پورے ڈبّہ میں گونجنے لگی تھی۔ لڑکی جب ناک کی آواز سنتی تو مجھے دیکھ کر اپنا مسکرانا روکنے لگتی۔ میں شرمندہ ہو کر جج صاحب کی طرف دیکھتا ہوا ہنس دیتا۔ لیکن معلوم نہیں اُس لڑکی کو کیا مذاق سوجھا تھا جو اُس نے اِس درمیان میں مارواڑی کی ناک کی آواز اور میرے درمیان ایک عجیب پُر مذاق تعلق قائم کر لیا تھا۔ ظاہر ہے مجھے اُس حرکت

سے اب گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اور کچھ دیر بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ مارواڑی کی ناک بولے یا نہ بولے وہ نظریں بچا کر میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھی تو میری پریشانی اور بڑھی۔ کیا بڑی بڑی آنکھیں تھیں اُس کی۔ اب تو میں اُن آنکھوں اور جج صاحب دونوں ہی سے ڈرنے لگا تھا۔

اویناش چپ باتیں سُن رہا تھا۔

معلوم نہیں میری پریشانی دیکھ کر یا کچھ اور سوچ کر جج صاحب بولے "بچّی کو نیند آ رہی ہو گی۔ اب کھانا کھا لینا چاہئے"۔ بی بی نے فوراً اُن کے خیال کی تائید کیا "جی ہاں، میں کہنے ہی والی تھی۔ دیر ہو رہی ہے آپ کے لئے"۔ اتنا کہہ کر وہ اُٹھیں اور نیچے سے ڈولچی گھسیٹنے لگیں جس میں ناشتہ دان رکھا تھا۔ اُس کام میں لڑکی نے بڑھ کر اُن کا ہاتھ بٹایا۔

کھانے پینے کا سامان ہوتے دیکھ کر جج صاحب نے مجھے متوجہ کر کے پوچھا "کیوں صاحب، آپ نے بھی تو ابھی کھانا نہیں کھایا؟ باتوں ہی میں رہ گئے"۔ میں چونکہ اُس سوال کے لئے تیار نہ تھا اس لئے گھبراہٹ میں سگریٹ جلاتے

ہوئے جواب دیا۔"جی نہیں، شکریہ۔ رات میں کھانے کی میری عادت نہیں۔" میری طرح جج صاحب تو کوئی بوکھلائے تھے نہیں۔ چنانچہ شاید لفظ 'شکریہ' پر مسکراتے ہوئے اُنھوں نے میری بات پکڑ لی۔" یہ تو آپ نے عجیب ہی بات بتائی۔ تو کیا رات کو آپ کھانا کھاتے ہی نہیں؟" اُس وقت اُن کی لڑکی اُن بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے کھانے کی جیسے دعوت دے رہی تھی۔ میں نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔"جی نہیں میرا مطلب سفر سے تھا۔"

جو جملہ پورا نہ ہو سکا تھا اُسے کوئی اہمیت کیا دیتا چنانچہ دیکھتے دیکھتے ناشتہ دان کا ڈھکن دو پرا سے اٹھے اور کئی ترکاریاں رکھ کر میرے سامنے بڑھا دیا گیا۔ میں کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنے میں گلاس کا پانی اُٹھانے کے لیئے وہ آگے بڑھی۔ میں نے چاہا کہ لپک کر گلاس خود اُٹھالوں۔ یہ تو میرا اُس کا ماتھا چھو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ گلاس میرے علاوہ کسی اور کے لئے بھی اُٹھایا جا سکتا تھا۔ لیکن جب گلاس کا پانی چھلک گیا تھا تو گلاس مجھ کو اُسے دینا ہی تھا۔ شاید ہم دونوں کے چہروں کو سُرخ

ہونے دیکھ کر، جج صاحب نے پراٹھے کا ٹکڑا چباتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے فرمایا۔" کوئی حرج نہیں۔ آپ کی بہن ہے۔" میں گلاس کا پانی پیتے وقت پانی پانی ہو رہا تھا اور جج صاحب کے جملہ کو سوچ رہا تھا۔" آپ کی بہن ہے۔"

ہاتھ منہ دھو کر بیٹھے تھے۔ جج صاحب کی بی بی سامنے پاندان پھیلائے پان بنا رہی تھیں۔ اُنھوں نے پان بنا کر دو بیڑے جج صاحب کو دیئے اور کچھ پان بیچ کی انگلیوں میں دبا کر، دو بیڑے مجھے دینے کو لڑکی کو دیئے، اِس لئے کہ وہ میرے قریب بیٹھی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا، سامنے بکس پر پیر پھیلائے سگریٹ کا گول گول دھواں منہ سے نکالتے ہوئے اوپر روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اِس لئے پوری صورت جب سمجھ میں آئی جب لڑکی کو سامنے ہاتھ میں پان کے بیڑے لئے کھڑے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی اور میری آنکھیں اس بُری طرح ایک دوسرے سے اُلجھ گئیں کہ اُن نگاہوں سے رہائی مشکل ہو گئی۔ جج صاحب اور اُن کی بی بی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے وہ کھڑی میری پریشانی پر مسکرا رہی تھی۔ میں نے جھٹ ایک طرف سے سر نکال کر

جج صاحب سے پان نہ کھانے کی اپنی مجبوری عرض کی ۔ لیکن موقع پانے پر وہ کہاں چھوڑتے " واہ صاحب، آپ تو اچھے ملے ۔ سگریٹ پیتے ہیں اور پان نہیں کھاتے ؟" کہہ کر وہ ہنسنے لگے ۔ بی بی اُنکی حاضر بیانی پر مسکرا رہی تھیں اور وہ لڑکی شاید میری حماقت پر ہنس رہی تھی ۔ لیکن میں اپنے قول پر اڑا رہا ۔ اِس لئے اُس نے پان لے جاکر جج صاحب کی بی بی کو دیدئے ۔ لیکن اُن کا مُنہ تو آپ ہی بھرا ہوا تھا ۔ چنانچہ پاندان بند کرکے مُنہ کا پان سنبھالتے ہوئے اُنھوں نے بہت مشکل سے کہا " لے جاؤ تم کھا ڈالو " میں لیٹا ہوا اپنی کمبختی پر کڑھ رہا تھا ۔ اُس کے ہاتھ سے پان پھر کہاں ملیں گے ۔

باوجود ہر مجبوری کے کھانے کے بعد سونا پڑتا ہے ۔ چنانچہ جگہ نہ ہونے پر بھی گود میں بچہ لئے جج صاحب کی بی بی اپنی جگہ پر پیر سمیٹ کر پڑ رہی تھیں ۔ جج صاحب اُن کے سرہانے ڈبہ کی دیوار سے سر لگائے آنکھیں بند کئے تھے ۔ میرے ' برتھ ' پر میرے پیر کے پاس چھوٹی لڑکی پیر پھیلا کر سو گئی تھی ۔ جہاں میری ' برتھ ' ختم ہوتی تھی وہیں ، جج صاحب کی بی بی کے پیر کے پاس ، دیوار سے کمر لگائے ، بڑی لڑکی بیٹھی کوئی

رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں اپنی پڑھائی لکھائی ختم کیے اپنی جگہ پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ بہرحال، بارہ بجے رات کے بعد میرے اور اُس کے علاوہ اُس وقت ڈبّہ میں سب ہی سو رہے تھے۔

سونا میں بھی چاہتا تھا۔ اُتنی رات کو کون نہ سونا چاہتا۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ اُسی ڈبّہ میں جب وہ دونوں بڑی بڑی آنکھیں جاگ رہی تھیں تو میں کیسے سو سکتا تھا۔

پڑھنے کو تو وہ کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ لیکن معلوم نہیں پڑھ رہی تھی یا کیا کر رہی تھی۔ کیونکہ جب میں اُس کی طرف دیکھتا تو اُسے اپنی ہی طرف دیکھتے پاتا۔ میرے دیکھتے ہی وہ رسالہ پڑھنے لگ جاتی۔ میں ٹرین میں پڑھنے سے زیادہ سوچنے کا قائل ہوں۔ چنانچہ جب کچھ پڑھتا بھی ہوں تو پڑھتا کم، سوچتا زیادہ ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد بدن پر لحاف ڈال کر تیاری تو میں نے بھی سونے ہی کی کی تھی۔ بلکہ جب جج صاحب کی آنکھیں کھُلی تھیں تو میں نے اپنی آنکھیں بند بھی لی تھیں۔ لیکن بغیر نیند کے آخر آنکھیں کب تک بند کیے رہتا۔ چنانچہ تھک کر آنکھیں کھولنی پڑی، باوجود اس نازک پہلو کے کہ سوائے میرے اور اُس کے بقیہ سب ہی اُس وقت ڈبّہ میں

سوئے ہوئے تھے۔ لیکن اُس طرح آخر کب تک پڑا پڑا روشنی تکتا رہتا۔ چنانچہ ایک طرح سے اُس کے پڑھنے سے شرمندہ ہو کر میں نے بھی اپنی کتاب تکیے کے نیچے سے نکالی اور اس طرح ہم دونوں رسالہ اور کتاب کے پیچھے سے غیر ارادی طور پر آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

اُس کے چہرے پر ایک عجیب خوبصورت بے چینی دیکھتے دیکھتے صورت حال میرے لئے کسی قدر نازک ہو چلی تھی۔ لحاف اوڑھے رہنے کے باوجود پیروں میں رہ رہ کر کنکپی سی محسوس کرتا۔ بدن کے اُوپری حصّہ میں گرمی اور بے چینی سی پھیل رہی تھی۔ باہنوں میں انگڑائی ہوتی اور بدن رہ رہ کر ٹوٹتا۔ غرضکہ اُس وقت میرے اور اُس کے درمیان جس قِسم کا ماحول پیدا ہو گیا تھا وہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

پیروں پر کمبل ڈالے وہ بیٹھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر اپنے اوورکوٹ کی جیب سے رومال نکالتی اور ریشمی رومال سے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو بے وجہ پونچھتی۔ اور کبھی کبھی یوں ہی رومال گال سے لگا کر آنکھیں رسالے میں گڑائے

دیر تک بیٹھی رہ جاتی۔ اُس وقت اُس کی انگوٹھی کے ہیرے کا
نگ بجلی کی روشنی میں اِس طرح چمکتا کہ اُس کی لامحدود دمک
میں جیسے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہونے لگتی۔ انگوٹھی، کن
پھول اور ناک کی کیل، تینوں کے پتّھر سبز رنگ کے تھے۔
تینوں زیور پنّے کے جڑاؤ کے ایک مکمّل سیٹ جیسے تھے۔
جب میں اُن پتّھر کے ٹکڑوں کو دیکھتا اُس وقت میری آتما
جیسے ایک چھوٹے سے مثلث میں گھر جاتی۔ پتھریلی سبز
روشنی کے تینوں ٹکڑوں سے بننے والے مثلث کے چکاچوند
میں میری نگاہوں کے ٹھہرنے کے لئے صرف ایک جگہ
ہوتی۔ اُس کا بایاں رخسار۔ لیکن رُخسار کا بھی ایک حصّہ،
اور شاید بہترین حصّہ ریشمی رومال سے ڈھکا ہوتا اِس وقت
گھنگھرالے بالوں کا ایک کالا لچھّا ریشمی رومال کو چھوتا ہوتا۔
چنانچہ اُس مثلّث کے سبز زاویوں سے جب میں چھوٹتا تو
گھنگرالے بالوں کے اُس لچھّے میں میری آنکھیں اُلجھ جاتیں۔
اور جب اُس سے رہائی ملتی تو اپنے کو ایک اور مثلّث میں گھرا
پاتا، جس کے ایک سرے پر تھے جج صاحب، دوسرے پر
اُن کی بی بی اور تیسرے پر سویا ہوا موٹا مارواڑی۔

معلوم نہیں وہ ڈرامہ کب تک چلتا رہا۔ میں ٹھیک نہیں بتاسکتا اِس وجہ سے کہ بیچ بیچ میں ذہنی غفلت کے کچھ ایسے دَورے پڑتے کہ مجھے معلوم نہ ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ بس اُسے دیکھتا اور سوچتا رہا ۔ اِتنا یاد ہے کہ اُس وقت وہ اپنے پیر میرے ہی 'برتھ' کے دوسرے سِرے پر رکھے بیٹھی تھی۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ دوسرے ہاتھ سے کھسکتا ہوا کنبل سنبھالنے لگی۔ میں نے سمجھا اُسے سردی لگ رہی ہے۔ اس لئے لحاف کا سرا اُس کی طرف بڑھانا چاہا۔ اُس کی مسکراتی ہوئی تیز نظر فوراً اُس چھوٹی لڑکی کی طرف گئی، جو میرے اُس کے درمیان سو رہی تھی۔ تب مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنی ماں کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے اُس نے میرا لحاف اپنے پیر سے ہٹا دیا۔ اب اپنی مورکھتا کو سوچ کر میں اور شرمندہ ہوا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ وہی گال سے ریشمی رومال لگا کر رسالہ پڑھنے والی ادا۔ اُس کے بعد اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے کو تیار ہی رکھا۔ پھر وہ آگے کی طرف بڑھی۔ میں بھی

اپنی جگہ سے کھسکا۔ اِتنے میں اُس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر داہنی طرف اپنے والدین کو دیکھتے ہوئے مجھے پان کے دو بیڑے پکڑا دیئے۔ پان لیتے وقت میں نے اُس کی بیچ والی اُنگلی پکڑ لی۔ مُسکراتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے اُس نے میری طرف ایسے دیکھا کہ جیسے اُس کی خوبصورتی اُنگلی چھوڑانے کے لئے سفارش کر رہی ہو۔ اُنگلی چھوڑ کر میں اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا پان کھا رہا تھا کہ اِتنے میں میری نظر جج صاحب پر پڑی۔ اُن کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میں ایک دم ڈر گیا۔

وہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھی اُسی طرح ہندی رسالہ پڑھتی رہی۔ رہ رہ کر سوئے ہوؤں کو دیکھتی، پھر مجھے ایک نظر دیکھ کر پڑھنے لگتی۔ مجھے جس چیز سے تشویش ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کا مُسکرانا کیوں ختم ہو گیا تھا۔ اُس وقت اِتنی سنجیدہ لگ رہی تھی کہ اُسے دیکھ کر مجھے فکر ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اُس نے اپنی جیب سے کچھ نکالا۔ میں نے دیکھا وہ پنسل تھی۔ رسالے کے کسی صفحہ پر لکھنے لگی۔ جب وہ لکھنا ختم کر کے رسالے کے پنّے میں سے لکھا ہوا حصّہ پھاڑ رہی تھی تو میں نے اپنا ہاتھ

باہر کر کے وقت دیکھنا چاہا۔ اُس وقت وہ خاموش مجھے دیکھ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ اُس کی خاموش نگاہوں کے دیکھنے کی تاب میں نہ لا سکا۔ نظر جھک گئی۔ اِس طرح میں اُس کی نگاہوں کی دعوت قبول نہ کر سکا۔

کچھ دیر باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی ۔ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ اُس کے بعد اُس نے گھوم کر سوتے ہوئے جج صاحب اور اُن کی بی بی کو دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھایا۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ٹکڑا لے لیا۔ اتنے میں اُس کی ماں نے کروٹ بدلی۔ اُس نے چونک کر اُس طرف دیکھا۔ کروٹ بدلتے وقت ماں کی نیند کھُل گئی۔ اُنھوں نے ایک بار اپنی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جج صاحب کو۔ اُنھیں سوتے دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھیں۔ جج صاحب بھی جاگ گئے۔ اُنھوں نے آنکھیں مل کر گھڑی دیکھی اور بولے ۔ "پونے تین ۔ شاید ایک اسٹیشن اور ہے"۔ لحاف میں مُنہ ڈھکے میں یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ کاغذ کا ٹکڑا میں نے چھپا لیا تھا۔ لیکن جج صاحب کی بی بی کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر میں اندر ہی اندر مرجھا رہا تھا اور سوچ

رہا تھا۔ اُنھوں نے دیکھ تو نہیں لیا؟ وہ اُٹھی اور اِدھر اُدھر
پھیلا ہوا سامان اکٹھا کرنے لگی۔ اب جو کھٹ پٹ ہونا شروع
ہوا تو اُس بہانے انگڑائی لیتا ہوا میں بھی جاگا۔ اُس نے
ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر بچّوں کو جگانے اور اُٹھانے
لگی۔ اُس کی سنجیدگی اور خاموشی دیکھ کر میں اندر ہی اندر اِس
خیال سے گھُل رہا تھا کہ آخر اُس نے کاغذ کے ٹکڑے پر کیا
لکھ دیا ہے جو ایسی ہوگئی ہے۔ ساتھ ساتھ جس بے باکی سے
ماں باپ سے باتیں کر رہی تھی اُسے دیکھ کر الگ میرا دم گھٹا
جا رہا تھا، اور کونے میں سکوڑا بیٹھا یہی طے کر رہا تھا کہ مجرم
کون اور جُرم کا ڈر کس کو!

لیکن میری خوشی مجھ سے الگ ہو چکی تھی۔ جو کچھ بیت چکا
تھا اُس پر حیرت ہو رہی تھی۔ جو ابھی بیتنے کو تھا اُسے
سوچ کر دل ابھی سے ڈوبا جا رہا تھا۔ لیکن جو کچھ ہونے کو
تھا اُسے دیکھنے کو اپنی ہی آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔

جس وقت میں اپنی لاکھ اُمیدوں سے اُسے دیکھ رہا
تھا اُسی وقت گاڑی اسٹیشن پر رُک گئی۔ دھیرے
دھیرے جج صاحب کا مال اسباب بھی اُترنے لگا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری لاش نکالی جا رہی ہو۔ جج صاحب کو دوسری طرف جانا تھا اور مجھے دوسری طرف۔ لوگ اُترنے لگے۔ سب سے پیچھے وہ تھی۔ جاتے جاتے اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا۔ دل ایسا اُچھلا کہ جیسے مُنہ سے باہر نکل کر اُس کے قدموں پر گر جائے گا۔ اُسے سنبھالتے وقت نمستے کا جواب بھی نہ دے سکا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پلیٹ فارم کی بھیڑ میں معلوم نہیں کب کھو گئی۔

میری گاڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اُسے پڑھنے لگا پنسل کی لکھاوٹ رسالے کے پھٹے ٹکڑے پر پڑھنا مشکل ہو گیا۔ مارواڑی جاگ گیا تھا۔ اُس نے ہنس کر کہا "بابو جی! آپ تو پان نہیں کھاتے ہے؟" جان نکل گئی۔ جج صاحب اور اُن کی بی بی نے بھی تو میرے سُرخ ہونٹوں کو نہیں دیکھا۔ کیا مارواڑی سب دیکھ رہا تھا؟

اویناش ایک دم میری بات کاٹ کر بولا۔" وہ کاغذ کا ٹکڑا تمھارے پاس ہے؟"

میں نے اُٹھ کر بکس کھولا اور کپڑوں کے نیچے بکس کے

تہہ میں سے اُس ٹکڑے کو نکال کر اوینا ش کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اوینا ش ایک سانس میں اُن چار سطروں کو من ہی من میں پڑھ گیا۔ اُسے چپ اور اُس کی آنکھوں کو پتھرائی دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "کیوں، کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے اُٹھ کر کمرہ سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "شیلا...... جج صاحب کی بھتیجی ۔میں...... میں نے تو اُس دعوتِ نظر کو منظور کر لیا تھا۔ پھر ایسا کیوں کیا؟"

میں اپنی جگہ کاٹھ ہو گیا تھا۔ بیچارہ اوینا ش شام کی گاڑی سے گھر چلا گیا۔ آخری پرچہ کے لئے امتحان میں بھی نہ بیٹھا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ اُن آنکھوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ اُسی وقت اوینا ش کی بھی یاد آتی ہے۔

اُردو ناول اور افسانے

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہندی اور اُردو دونوں دُو دنیا کی چیزیں ہیں۔ ہندی اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں سے مِل کر آدمی ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے ہندی اور اُردو دونوں ایک دوسرے سے اِتنے ہی مختلف اور دُور ہیں جتنے، مثال کے طور پر، انگریزی اور چینی۔ اور اگر آج کے اخبارِ ل کو پڑھ کر ہندی اُردو کے درمیانی فاصلہ اور جھگڑوں کو آپ سوچتے ہیں تو ہندی اور اُردو کے درمیان جتنی دوری آپ محسوس کریں گے اُتنی دُنیا کی شاید ہی کسی اور دُو زبانوں کے درمیان آپ کو نظر آئے گی۔ ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہندی اُردو کی یہ لڑائی دُو پہلوانوں کی کوئی کُشتی نہیں ہے، جو پہلوانوں کی جسمانی صحت اور قوت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ بلکہ یہ دُو

بھائیوں کے درمیان وہ جھگڑا ہے جو گھر کو مٹا دینے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے، کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچّے دل سے یہ چاہیں گے کہ یہ جھگڑا اور بڑھے یا قائم رہے۔ لیکن صرف یہ سمجھ لینے سے کہ یہ جھگڑا ہمارے حق میں اچھّا نہیں ہے جھگڑا ختم نہیں ہو جائے گا، کیونکہ جیساکہ آپ جانتے ہیں، اِس جھگڑے کے پیچھے اور بھی بُنیادی جھگڑے ہیں۔ مجھے یہاں اُن جھگڑوں سے واسطہ نہیں۔ اِس وقت ہمیں صرف یہی دیکھنا ہے کہ آیا سچ مچ ہندی اور اُردو کے درمیان اِتنا فاصلہ ہے جتنا ہم لوگ اب سوچنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ہندی اور اُردو کے پورے ادبی دائروں اور زاویوں پر بحث کرنے اور اُن کے جائزے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف اُردو ناولوں اور کہانیوں پر نظر ڈالیں گے۔ اُردو ناولوں اور افسانوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر آپ آسانی سے اُن کا مقابلہ ہندی اُپنیاسوں اور کہانیوں سے کر کے دیکھ لیں گے کہ کتنی ملتی جُلتی ہے دونوں کی دُنیا، کتنی متوازی ہیں دونوں کی تاریخیں اور کیسے یکساں ہیں دونوں کے بُنیادی مسئلے۔ آپ ہندی

ناولوں اور کہانیوں سے واقف ہیں ہی - اِس لئے، خاص طور سے وقت کی کوتاہی کی وجہ سے، یہاں یہ ممکن نہ ہوگا کہ اُردو کے ساتھ ساتھ ہم ہندی ناولوں اور کہانیوں کا تذکرہ بھی کرتے چلیں۔

اُردو ناولوں کی کہانی بہت پُرانی نہیں۔ ہندی اُپنیاس کی طرح اُردو ناول بھی ہمارے لئے ایک طرح سے انگریزی زبان کی دین ہے۔ نذیر احمد کو ہم ایک طرح سے اُردو کا پہلا ناول نگار کہہ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی پہلی ناول سنہ ۱۸۶۹ء میں لکھی۔ اس کے بعد لکھتے ہی رہے اور اپنی زندگی میں اُنھوں نے کئی ناولیں مکمّل کیں۔ اُن کی زبان میں بڑا لوچ تھا۔ ہنستے ہنساتے باتیں کہہ جاتے تھے۔ سماج سدھار ہی اُن کی ناولوں کا مقصد تھا۔ زمانہ وہ تھا جب کہ انگریزی تعلیم کا اثر اور دائرہ اِس دیش میں بڑھتا ہی جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی انگریزی شاعری یا انگریزی ڈرامہ وغیرہ کے بہ نسبت انگریزی ناول زیادہ پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھیر ڈھیر سے یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں ناول پڑھنے کا

رواج بڑھنے لگا۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندی اور اُردو میں بھی نئے نئے ناول لکھنے والے پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ نذیر احمد کے بعد سرشار اور شرر اُردو ناول نویسی کے میدان میں آئے۔ رتن ناتھ سرشار کے 'فسانۂ آزاد' کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ سرشار سے بڑھ کر اُردو میں دوسرا ناول نگار نہیں پیدا ہوا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ادب اور ادیبوں پر اس تنگ نظریہ سے سوچنا کتنا غلط طریقہ ہے۔

سرشار کے بعد اُردو میں بہت سے ناول لکھنے والے پیدا ہوئے، جن کی فہرست لمبی ہے۔ لیکن حکیم محمد علی خاں، ڈاکٹر رسوا اور سجاد حسین وغیرہ کی چیزیں پڑھ کر اُس وقت کے اُردو ناول کے رجحان کا اندازہ مل سکتا ہے۔ فن کے لحاظ سے اُن لوگوں نے ناول نویسی کو کوئی ترقی نہیں بخشی۔ بلکہ انگریزی ناولوں ہی کا اثر چھاتا گیا۔ ناول کے مضامین ضرور وقت کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہے۔

اِس کے بعد منشی پریم چند کا زمانہ آتا ہے۔ منشی پریم چند کی جگہ اُردو میں وہی ہے جو ہندی میں۔ بلکہ پریم چند کے بارے میں یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ منشی جی دراصل ہندی یا اُردو کے

ادیب تھے۔ بہرحال منشی جی کے بارے میں ہم صرف یہی کہنا چاہیں گے کہ ہندوستانی ادب میں پریم چند وہ سورج تھے جس کی روشنی ہندی اور اُردو دونوں ادبوں پر برابر پڑتی تھی۔ پریم چند کے قلم نے اُردو ناول نگاری کو اُسی اونچائی اور پختگی پر پہونچایا جس پر ہندی اُوپنیاس اُن کی لیکھنی کی بدولت پہونچا۔

پریم چند کے بعد یوں تو اُردو میں بہت سے ناول لکھنے والے ہمارے سامنے آئے۔ لیکن میری رائے میں پریم چند کی بلندی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ یورپ کے ادب سے اثر لے کر بہت سے نوجوان لکھنے والے ناولیں لکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن اُن میں سے زیادہ کامیابی کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ایسی حالت میں صرف نام گنانے سے کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ پھر بھی فیاض علی، راشد الخیری، عظیم بیگ چغتائی، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یوں بکنے کو فیاض علی صاحب کی ناولیں خوب ہی بکتی ہیں۔ "انور" شاید بہت جلد تصویر بن کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ راشد الخیری کی "ماہ عجم" خوب ہی پڑھی گئی۔

چغتائی تو ہندی میں بھی لکھتے تھے ۔'کول تار'، اور 'انگوٹھی کی مصیبت'، وغیرہ سے آپ واقف ہیں۔ نیاز فتحپوری زبان ایسی لکھتے تھے کہ اگر ناول نہ بھی لکھتے تب بھی پڑھے جاتے۔ مجنوں گورکھپوری نے اُردو ادب کے واسطے جہاں اور بہت کچھ کیا وہاں اُنھوں نے 'سوگوار شباب' بھی لکھا۔ سجّاد ظہیر صاحب لندن گئے تھے اس لئے اُنھوں نے 'لندن کی ایک رات' لکھی۔ چونکہ اُس وقت انگریزی میں جاسوسی ناولوں کا زور چل رہا تھا اِس لیئے اُردو میں بھی جاسوسی ناول لکھے جانے لگے۔ 'نیلی چھتری'، 'بہرام کی گرفتاری' وغیرہ کے نام تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔

پریم چند کے بعد اُردو ناول لکھنے والے ناکامیاب کیوں رہے، اِس پر بحث کرنے کے بجائے اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ اُردو میں وقت سے پہلے ناول کی موت کیوں ہوگئی تو بہتر ہوگا۔ میری نظر میں اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ناول کے مقابلہ میں افسانہ کا رواج اُردو میں ایسا چل نکلا کہ ناول کو کہانی کی کامیابی اور عام قبولیت کو دیکھ کر خودکشی کرنی پڑی۔

یوں تو ہندی میں بھی ناول پر کہانی کی پیداوار اور خوبی بھاری

پڑ رہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو کی طرح ہندی میں بھی ناول اور ناول لکھنے والے ختم ہو گئے۔

میری سمجھ میں یہ بھی پچھمی ادبی تحریک کا نتیجہ اور اثر ہے۔ زمانہ اور زندگی کا انداز بدل جانے سے پچھمی دیشوں میں افسانے زیادہ پڑھے جانے لگے۔ ناول سے افسانہ کا لکھنا اور پڑھنا دونوں آسان کام معلوم ہوئے۔ آئے دن زندگی کی مصروفیتیں اور پریشانیاں ایسی بڑھتی جاتی تھیں کہ پوری کی پوری ناول لکھنا یا پڑھنا دونوں غیر مقبول ثابت ہوتے گئے۔ آپ پوچھیں گے کہ کیا یہی وجہ ہے اُردو ناول کے مرنے کی بھی۔ یعنی کیا ہماری سماجی زندگی نے بھی وہی ڈھنگ یک بیک اختیار کر لئے جن کی وجہ سے پچھمی ملکوں میں ناول پر افسانہ کو برتری نصیب ہو رہی تھی؟ جواب میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو اُس وقت بھی ناول پڑھنے کو کافی فرصت تھی۔ ناول لکھنے کا مواد بھی ہماری سماجی زندگی میں اتنا موجود تھا کہ تقریباً پورا کا پورا فرانسیسی روسی یا چینی 'ناولی' ادب یہاں پھر سے ایک بار دوہرایا جا سکتا تھا لیکن انسانی تہذیب اور معاشرت ہمیشہ آسان اور سہل

ہی راستہ سے چلنا پسند کرتی ہے۔ چنانچہ جب ہندوستانی ادیبوں نے وہ سہل راستے یورپ کے افسانہ نویسی کے فن سے حاصل کر لئے تو انھوں نے بھی وہی آسان اور مختصر راستے اختیار کر لئے۔ اور غضب تو یہ ہے کہ یہ نقالی اتنی بڑھتی جارہی ہے کہ حال میں پچھمی ادب نے جو سستگی اور رومانی چھچھلا پن قبول کر لیا ہے وہی آج ہمارے ادب کی بھی وردی بنتا جارہا ہے، حالانکہ یہ عناصر ہماری سماجی یا انفرادی زندگی کی خصوصیت کبھی بھی نہ تھے۔ یہ ہندی اور اُردو لکھنے والوں دونوں ہی پر صحیح اُترتا ہے۔

چنانچہ اُردو میں اِس وقت جتنے چوٹی کے لکھنے والے ہیں وہ سب کے سب اپنا لگ بھگ سارا وقت افسانہ نویسی ہی کو دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو افسانے آج اُردو میں لکھے جارہے ہیں وہ اس پایہ کے ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر بہت حد تک اُردو میں ناول نہ ہونے کے آنسو پُنچھ جاتے ہیں۔ اِن افسانوں کو دیکھ کر ہم یہ بھی کہنے کی ہمت کر سکتے ہیں کہ ہمارے اچھے افسانے دوسرے مُلکوں کے اچھے افسانوں کے مقابلہ میں بُرے بھی نہیں ہیں۔

جب ہم موجودہ اُردو افسانہ نگاری کو سوچتے ہیں تو ہمیں علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اختر حسین رائے پوری، راجیندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، اختر اُورینوی، احمد علی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، سہیل عظیم آبادی، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی وغیرہ بیک وقت یاد آتے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں میں نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور سدرشن وغیرہ جگہ رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہندی کی طرح اُردو افسانہ نگاری میں بھی پریم چند ہی نے ہمیں صحیح راستہ پر لگایا۔ لیکن اُن کا طرز اور اثر بہت تیزی سے اُردو افسانہ نگاری پر سے اُٹھتا جارہا ہے۔ اور اگر اُن کا اثر کسی ایک افسانہ نگار میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو علی عباس حسینی کے افسانے پڑھئے۔ 'میلا گھومنی'، جسے حسینی صاحب بھی اپنے بہترین کہانیوں میں مانتے ہیں، پریم چند کو جیسے ہمارے سامنے لاکر کھڑی کر دیتی ہے۔ لیکن کرشن چندر سے آگے وہ اثر کم ہونے لگتا ہے۔ اور محمد حسن عسکری اور اُن کے بعد کے لکھنے والوں میں تو وہ اثر قریب قریب بالکل نظر نہیں آتا۔

اُردو کہانی لکھنے والوں کی کہانیاں ہندی میں اکثر چھپتی

رہتی ہیں۔ اشک جیسے کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں جو ہندی
اور اُردو دونوں زبانوں میں بیک وقت لکھتے ہیں۔ دیویندر
ستیارتھی کا نام بھی آپ نے اِسی سلسلہ میں سُنا ہوگا۔ لیکن پھر
بھی شاید آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر اُردو والے لکھتے کیا
ہیں۔ اِس لیئے آپ کی تسکین کے لئے مختصر طور پر میں اُردو
افسانہ نگاروں کی مجموعی ادبی کوشش کا خاکہ کھینچنے کی یہاں
کوشش کروں گا۔ لیکن اِس کے لئے یہ ضروری ہے کہ صرف
نمایندے افسانہ نویسوں کو لے کر آگے بحث کی جائے۔

کرشن چندر صاحب کا بچپن چونکہ کشمیر کی وادیوں میں گزرا تھا
اِس لئے عموماً اُن کی کہانیوں کا پس منظر کشمیر ہوتا ہے۔ اُن
کے افسانے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زندگی کا
اُنھیں کسی قدر تلخ تجربہ ہے۔ چنانچہ اُن کے ہر افسانہ کا موضوع
عام طور سے کسی نہ کسی قسم کا شکست ہوتا ہے۔ "شکست"،
نام کی اُن کی ایک ناول بھی ہے۔ لیکن در اصل وہ ناول کم،
افسانہ زیادہ ہے۔ یعنی اُسے پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ افسانہ کو گھما پھرا کر ناول بنا دیا گیا ہے۔ کرشن چندر میں
یہ خاص قسم کی خوبی یا خامی ہے۔ اُن کی بہت سی کہانیاں

ویسے کہنے کو کہانیاں ہی ہیں لیکن اُن میں اکثر ناول کا مواد ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں کبھی کبھی ناولوں کے آثار دکھائی پڑتے ہیں اور اُن کے ناول سے کہانی کی بو آتی ہے۔ مگر اس سے نتیجہ نکال کر میں یہ نہیں کہوں گا کہ کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار اور ناول نگار دونوں حیثیتوں سے ناکامیاب ہیں۔

ان کے افسانوں میں مجھے "سیما" اور "زندگی کے موڑ پر" نام کے افسانے بہت پسند ہیں۔ لیکن یہ دونوں افسانے ناول بھی ہو سکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ نہ تو وہ اصلی معنوں میں افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ناول نگار۔ بلکہ اُن کی موجودہ جگہ کہیں درمیان میں ہے، اور وہ شاید ابھی تک طے نہ کر سکے کہ اُن کی پوری بات افسانہ یا ناول میں کہی جا سکتی ہے۔ لیکن کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کرشن چندر بحیثیت ایک افسانہ نویس کے ناکامیاب ہیں۔ اُن کی "آنگی" پڑھ کر ایسا کہنے کی کون جرأت کر سکتا ہے۔

آج کے لکھنے والوں کی پیٹھ پر ایک قسم کا "لیبل" لگا ہونا کچھ لوگوں کی نظر میں ضروری ہو گیا ہے۔ یعنی لکھنے والا ترقی پسند

ہے یا نہیں۔ کرشن چندر کو میں ترقی پسندوں کے ساتھ اس وجہ سے رکھتا ہوں کہ وہ اپنے افسانوں کی مدد سے عام طور سے سرمایہ داری کی مخالفت اور اشتراکیت کا پرچار کرتے ہیں۔ اشتراکی ہونے کی وجہ سے جگ جیون پر نکتہ چینی کرنا کسی قدر ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کی نکتہ چینی کا بھی ایک خاص ڈھنگ ہوتا ہے۔

اُن کے افسانے چھوٹے چھوٹے قصوں، کہانیوں، واقعات اور چٹکلوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں 'پلاٹ'، ہونا ضروری نہیں۔ چلتے پھرتے واقعات پر ایک خاص نظریہ کے ماتحت روشنی ڈالنا اور اس طرح پورے سماج اور انسانی زندگی پر چھینٹے ڈالنا اُن کی مخصوص ادائیں ہیں۔ جیسے یہاں سمجھنے کے لئے مان لیجئے کہ آج دیوالی کی رات ہے۔ گھر گھر چراغ جلے ہوئے ہیں۔ کافی رات ہو جانے سے کچھ چراغ بجھ بھی چکے ہیں، بہت سے بجھنے والے ہیں۔ بقیوں کی زندگی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی وقت ایک گدھا شہر کے کسی کونے سے زور زور سے رینکنا شروع کرتا ہے۔ کرشن چندر گدھے کے اس رینکنے کو رینکنا نہیں کہیں گے بلکہ

اُسے اُس کا رونا یا ہنسنا بتائیں گے۔ پھر گدھے کے رینگنے سے کچھ اِس قسم کے نتیجے نکالیں گے۔

"اے دنیا والو، تمھاری آتماؤں میں تاریکی گھس چکی ہے کیونکہ تمھاری زندگی پر سرمایہ داری چھائی ہوئی ہے۔ اگر چراغ جلاکر بھی اپنا ضمیر روشن کرنا چاہو تو تم کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اِس لئے کہ دیکھو تمھاری مفلسی تیل کی قلّت کی وجہ سے تمھارے جلائے ہوئے چراغوں کو بجھائے دے رہی ہے"۔

یہ رہے کرشن چندر۔ اُنکے بعد سعادت حسن منٹو کی جگہ اُردو افسانہ نویسی میں آتی ہے۔ لیکن منٹو صاحب معلوم نہیں کیوں باوجود ایک اچھے کلاکار یا فن کار اور نہایت ہی ذہین آدمی ہونے کے اپنے افسانوں کا مضمون صرف جنسیات بنائے ہوئے ہیں۔ ویسے تو اُن کے افسانوں میں عورتیں ہیں، شراب ہے، سگریٹ کا دھواں ہے، طوائفیں ہیں، تحلیل نفسی (Psychoanalysis) ہے، اور منٹو صاحب خود بھی ہیں۔ لیکن منٹو کے افسانوں کا موضوع خاص طور سے صرف عورت ہے، یعنی جہاں عورت ختم ہوتی ہے وہیں منٹو کے افسانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس کرشن چندر کے افسانے عموماً وہیں سے شروع ہوتے

ہیں جہاں عورت ختم ہو جاتی ہے ۔ منٹو اور کرشن چندر کے
آرٹ ، میں یہ سب سے بڑا فرق ہے ۔

ہانڈی کے چند چاولوں کو ٹٹول کر کھچڑی کا اندازہ کیا جاتا
ہے ۔ چنانچہ اُردو افسانہ نگاری کا مجموعی طریقے سے جائزہ
لینے کی غرض سے اگر دو اور لکھنے والوں کا ذکر ہو جائے تو کسی
حد تک کام چل جائے گا۔

یہ دو حضرات ہیں علی عبّاس حسینی اور محمد حسن عسکری ۔
ویسے لکھنے کو حسینی صاحب اب بھی لکھتے ہیں لیکن تاریخی رُو
سے حسینی کرشن چندر سے بھی پہلے آتے ہیں۔ عسکری کرشن چندر
سے بہت بعد میں آتے ہیں ، حالانکہ لکھنے کو دونوں اس وقت
ساتھ ساتھ لکھ رہے ہیں ۔ عسکری ابھی بالکل نوجوان ہیں یا
یہ کہیئے کہ بہت نوجوان ہیں ۔ حسینی اگر بوڑھے نہیں تو جوان
بھی نہیں ہیں ۔ حسینی کے ایک مجموعہ کا نام ہے باسی پھول ۔
معلوم نہیں یہ اُن کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے یا نہیں ۔
لیکن معلوم نہیں کیوں یہ نام مجھے بھلائے سے نہیں بھولتا ۔
بلکہ جب حسینی صاحب کو سوچتا ہوں تو باسی پھول یاد آتا ہے
اور جب باسی پھول سوچتا ہوں تو حسینی یاد آتے ہیں گویا

اُردو افسانہ نگاری میں حسینی باسی پھول ہیں۔

عسکری موجودہ افسانہ نگاروں میں سب سے نئے مانے جاتے ہیں، حالانکہ اُردو میں افسانے لکھنے والوں کا سلسلہ اُن کے بعد کچھ ٹوٹ نہیں گیا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر اُن کو حسینی سے کیا نسبت؟ لیکن میری نظر میں نسبت ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں لکھنے والوں کے درمیان ہمیں جو فاصلہ ملتا ہے وہی ترقی یا تنزلی کی منزلیں اُردو افسانہ نگاری پچھلے پچیس سالوں میں طے کر پائی ہے۔

عسکری پر خاص طور سے فرانس کے ادیبوں کا اثر ہے، اتنا کہ اُن کے آرٹ میں بھی کبھی کبھی وہی موہومیت نظر آتی ہے جو آخری اُنیسویں صدی کے فرانسیسی فن کاروں کی تصنیف کی خصوصیت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر خدا کی مہربانی سے آپ نے اُن کے افسانوں کا مطلب سمجھ لیا تو پھر کیا کہنا ہے۔ سمندر کی تہہ میں پہونچکر موتی ملتے ہیں، قطب مینار پر چڑھ کر دلی دکھائی دیتی ہے۔ یہی ہے عسکری کا آرٹ۔

لڑکیاں اُن کے افسانوں کی بھی تانا بانا ہوتی ہیں لیکن

اِن کی لڑکیوں کی چند خصوصیتیں ہیں۔ یعنی عام طور سے یہ لڑکیاں غریب عیسائی گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ سانولی یا کالی، تھوڑی پڑھی لکھی، قبول صورت یا غیر قبول صورت لڑکیاں۔ لیکن ایک ایک کے دل میں آگ کے دہکتے ہوئے جیسے کمہاروں کے آنوے کے آنوسے چھپے ہوئے ہیں۔

بحیثیت ایک اچھے اور اونچے افسانہ نگار کے جگ جیون پر یہ بھی نکتہ چیں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اِس میں اُن کا ڈھنگ بالکل مختلف اور عجیب ہے۔ بس سمجھنے کے لئے ہوسٹل میں رہنے والی دو ایسی لڑکیوں کو سوچیے جو ایک لحاف کے نیچے سوئی ہوئی ہیں۔ ایک لڑکی کے داہنے پیر میں کالا موزا ہے اور بائیں پیر میں سفید موزا۔ دوسری لڑکی کے داہنے پیر میں سفید موزا اور بائیں پیر میں کالا موزا ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے موزوں کو دیکھتی ہیں اور اندر ہی اندر اپنے اور ساتھ ساتھ جگ جیون پر کڑھتی ہیں۔ لیکن بات یا تو کہنا نہیں چاہتیں یا سمجھتی نہیں ہیں۔ موزے بدل کر ایک کے پیروں میں صرف سفید اور دوسرے کے پیروں میں صرف کالے موزے ہو سکتے ہیں لیکن ہوتے نہیں۔ اور اگر ہو سکتے

ہیں تو کیا لڑکیاں موزے بدل لیں گی؟ اگر آپ عورت کی فطرت سے واقف ہیں تو جواب دیں گے "نہیں، لیکن اگر لڑکیاں آپس میں موزے بدل بھی لیں تو کیا وہ خوش ہو سکیں گی؟ عسکری صاحب مسکرا کر اپنے مخصوص لہجہ سے کہیں گے "جی نہیں"

اخیر میں یہ کہنے دیجئے کہ اُردو ناولوں اور افسانوں میں تقریباً وہی باتیں اور وہی مرحلے ہیں جو ہندی میں آپ کو ملتے ہیں۔ وہی دُکھ سُکھ، وہی حُسن و عشق، وہی غریبی کے دُکھڑے اور امیری کے گھمنڈ، وہی آدمی کی مایوسی اور ناکامی بھی۔ اُردو لکھنے والے ہندی لکھنے والوں سے بہت مختلف نہیں ہوتے۔ ویسے یہ صحیح ہے ہی کہ کسی کو کچھ سوجھتی ہے، کسی کی نظر کسی پر جاتی ہے۔ اپنے اپنے لکھنے کا ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ باتیں آپ کو ہندی کے لکھنے والوں میں بھی ملیں گی، ورنہ سب ہی ہندی کے ادیب ایک ہی سی اور ایک ہی بات نہ لکھتے ہوتے۔

اور ہاں، بھولا ہی جا رہا تھا۔ ایک بات اور۔ ہندی کی طرح اُردو میں بھی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں کہانیاں اور ناول لکھنے والی آپ کو ملیں گی۔ چنانچہ اُردو میں بھی

اِس قسم کے نازک قلم لو ہے جیسے سخت مضامین پر چل رہے ہیں۔ اِن کی تعداد اب اچھی خاصی ہو رہی ہے۔ لیکن خاص طور سے عصمت چغتائی صاحبہ اپنے قلم کی بدولت اُردو میں اچھا خاصہ درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

تین سال بیت گئے۔ شبل کمل کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک بڑے شہر میں رہتی تھی۔ خاوند اُس کے کسی اچھے اخبار میں مقامی نامہ نگار تھے۔ اخباروں کے نامہ نگاروں کی زندگی یوں ہی کتنی مشغول ہوتی ہے، اور اگر نہیں ہوتی تو اُسے مشغول بنائے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بڑے انگریزی روزانہ اخبار کا نامہ نگار ہونا بھی دراصل کوئی چیز ہے۔ اور شبل کمل کے خاوند تو مقامی نامہ نگار تھے۔ جہاں سے اخبار نکلتا ہے، وہاں کے مقامی نامہ نگار کی خاص ذمہ داری ہوتی ہیں۔ اور شہر بھی کتنا بڑا تھا، جہاں سے وہ انگریزی روزانہ اخبار نکلتا تھا۔

اگر کام زیادہ نہ بھی ہو تب بھی، نامہ نگاروں کی جیسی عادت یا فطرت ہوتی ہے، وہ اپنے کو مشغول بنائے رہتے ہیں۔ اس کی

شاید یہ وجہ ہے کہ نامہ نگاروں کا کام ہی ایسا ہوتا ہے کہ، وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اُن کی زندگی کو مشغول ہونا پڑتا ہے۔ اور جب عام طور سے ایسا مانا اور سمجھا جاتا ہے تو نامہ نگار کو، اگر اُسے اپنی زندگی کامیاب بنانا ہے، مجبوراً اپنے کو مشغول رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر وہ مشغول نہیں ہے یا اپنے کو مشغول نہیں بنائے ہوئے ہے تو دوسرے سمجھیں گے کہ وہ اچھا یا کامیاب نامہ نگار نہیں ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کان سے کھونٹ نکالنے والوں کو باجی راؤ پیشوا یا نانا فرنویس کی طرح پگڑی باندھے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کان سے کھونٹ نکالنے کو مرہٹا بادشاہوں کی طرح پگڑی باندھنے سے، نزدیک یا دور کا، کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی پیشہ تو پیشہ ہی ہے۔ اور جب آدمی کسی پیشہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی روایتوں کو اُسے ماننا ہی پڑتا ہے، ورنہ بغیر مراٹھی پگڑی باندھے گلیوں گلیوں مارا پھرے کوئی بھی کھونٹ کا ہے کو نکلوائے گا۔

یہ پیشے کی بات ہے اور ایسے پیشہ والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ روزانہ اخبار کے نامہ نگار کی کیا زندگی ہوتی ہے یہ وہی

جانتا ہے یا شیل کمل جانتی تھی۔ نامہ نگار عموماً ایک عجیب دنیا میں رہتا ہے، اور اُس ذہنی دنیا میں اُس کی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اُس کی نظر میں دنیا دنیا نہیں ہوتی، بلکہ دنیا خبر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو دنیا سمجھ کر نہیں دیکھتا پہچانتا، بلکہ دنیا کو ایک بہت بڑی خبر سمجھ کر اُس کے لئے بھاگتا دوڑتا رہتا ہے۔ اُس کے واسطے کسی کا مرنا مرنا نہیں ہے، بلکہ خبر ہے۔ کسی کا جینا اُس کے لئے جینا نہیں ہے بلکہ خبر ہے۔ غرضکہ دنیا کی ہر چیز اُس کے لئے خبر ہے، اُس کا اخبار بھی خبر ہے، اپنی بی بی کے لئے وہ خود خبر ہے اور شیل کمل اُس کے لئے خبر ہے۔

ایسے کے ساتھ جب شیل کمل کی شادی ہوئی تھی تو اُس کی زندگی کیا اور کس قسم کی ہو سکتی تھی اسے سوچنے میں اُس کو زیادہ دیر نہ لگی۔ ویسے تو خاوند اُس کے ہر وقت مشغول رہتے تھے لیکن اِن دنوں خاص طور سے اُن کی زندگی جیسے طوفان ہو رہی تھی۔ اُن کی نظر میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہر وقت ہو رہا تھا، اور اُس فیصلے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا، کیونکہ اُس فیصلہ کی خبر دنیا کو دینا اُنھیں کا کام تھا، ورنہ دنیا والوں کو کیسے معلوم ہوتا کہ دنیا کے ساتھ یک بیک کیا گذر گیا۔

اس کے علاوہ، لگ بھگ دس لاکھ آبادی کے ایک صنعتی اور روزگاری شہر کا مقامی نامہ نگار ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں، جہاں چھوٹی بڑی ہڑتالیں روز ہوا کرتی ہیں، جہاں مل مالکان کو مزدوروں سے ہمیشہ شکایت رہتی ہے، جہاں پونجی مشقّت کا خون چوس کر بڑھتی ہے، جہاں دولت کی روشنی میں مفلسی اپنا چراغ ہر شام جلاتی ہے، جہاں کچھ رات گئے اور کچھ رات رہے طوائفیں اپنے دروازے کھولتی اور بند کرتی رہتی ہیں، جہاں آدمی کے ہاتھوں آدمی کا خون اور پسینہ روز بہتا اور بکتا ہے، جہاں قتل کی نگرانی پولیس ہر وقت کرتی ہے اور جہاں قاتل کو حکومت پھانسی کے تختہ پر روز پہونچاتی ہے۔

اور پھر یہ تو لڑائی کا زمانہ ہے۔ دنیا اور زمانہ کو جیسے آگ لگی ہوئی ہے۔ پیسہ پھنک رہا ہے اور پیسہ بن رہا ہے۔ آدمی کے دل میں خوف ہے اور امید بھی۔ دنیا بگڑ رہی ہے اور بن بھی رہی ہے۔ دہشت ناک ہل چل ہر وقت پھیلتی رہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ جا کہاں رہے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا۔ جگہ جگہ سے انقلاب کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ مزدوروں کی بستیاں سوکھی لکڑی کی ڈھیر بنی ہوئی ہیں۔ انھیں بستیوں میں

چوہے رہتے ہیں، جو رات ہی کو اپنی بلوں سے نکلتے ہیں۔ ایک بستی سے دوسری بستی اور پھر دوسری سے تیسری بستی میں چلے جاتے ہیں۔ مزدوروں کے جھونپڑوں میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں، جو نہ مزدور سمجھتے ہیں اور نہ وہ خود سمجھتے ہیں۔ صبح کو جب یہ چوہے اپنی بلوں میں چھپ جاتے ہیں تو بجلی کے کھمبوں پر، دیواروں اور مِل کے پھاٹکوں پر لال لال اشتہار چپکے نظر آتے ہیں۔ رات کو بڑے بڑے جلوس ہاتھوں میں مشعل اور بتی لئے نکلتے ہیں۔ جب گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دیتی ہے تو یہ مشعلیں اور بتیاں بجھ جاتی ہیں۔ پھر دور سے آسمان پھاڑنے والے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ جلوس نکل جاتے ہیں تو دور دور سے، 'ہؤ ہؤ'، کی آوازیں آتی ہیں۔ آدھی رات کو سیار بولتے، اُلو چیختے اور کتے بھونکتے ہیں۔ کتے ایسے بھونکتے ہیں جیسے شہر کے باہر مشین گن 'ککاٹو، ککاٹو'، کر رہی ہو۔ ان آوازوں سے سونے والے شہری چونک اُٹھتے اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے شہر کے باہر دشمن آ گئے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن کچھ نہ تھا جب تک کہ نامہ نگار اس سب کی خبر چھپنے کو اخبار میں نہ دیتا۔ ایسی زندگی تھی شبیل کمار کے

شوہر کی۔ وہ شیل کمل کو بہت سمجھاتا، لیکن وہ زیادہ سمجھ نہ پاتی۔

....

جاڑے کی رات تھی شیل کمل اور اُس کے شوہر آتشدان کے پاس صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نوکر نے باہر سے آکر اطلاع کی کہ کوئی ملنا چاہتا ہے۔ جاڑے پالے میں باہر کون جاتا۔ اس لئے نامہ نگار نے آنے والے کو کمرہ ہی میں بلوا لیا۔ سوتی کپڑے کا کوٹ اور پتلون پہنے، ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا لئے، ایک آدمی کمرہ میں داخل ہوا۔ نامہ نگار نے سامنے کی کرسی پر اُسے بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ آدمی کا بدن چوڑا اور مضبوط لیکن دُبلا تھا، اور چہرہ وقت سے پہلے بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ نامہ نگار آدمی سے باتیں کر رہا تھا اور شیل کمل پریشان اُس کی بگڑی داڑھی اور سر کے بکھرے ہوے بڑے بڑے بالوں کو دیکھ کر حیرت کر رہی تھی۔ بیمہ کمپنی والوں سے کون نہیں جان بچانا چاہتا۔ لیکن نامہ نگار زیادہ پریشان ایجنٹ کے عجیب و غریب حلیہ سے تھا۔ ایجنٹ کا اتنی رات کو آنا بھی کم پریشان کرنے والی چیز نہ تھی۔ لیکن اُس کی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ خود ایجنٹ کی پریشانی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھول کر یا غلطی سے چلا آیا تھا۔ اور

اُس کی پریشانی کی صحیح وجہ بھی اُسی وقت معلوم ہو سکی جب اُس نے شیل کمل کو متوجہ کر کے کہا "آپ نے پہچانا نہیں" صورتِ حال کو سمجھ کر اور اُس پر قابو پا کر شاید اُس نے طے کر لیا تھا کہ بغیر اُس جملہ کے شیل کمل کی پریشانی کم نہ ہو گی۔

شیل کمل جیسے ڈر کے جذبہ پر قابو حاصل کرتے ہوئے، لیکن اپنی آنکھوں کا اب بھی یقین نہ کر کے ــــ "کیوں ہریش بابو! آپ ؟"

نامہ نگار اپنی آنکھوں سے شیل کمل اور ایجنٹ دونوں کو کھائے ڈال رہا تھا۔ اور جب کسی طرح اپنی پریشانی پر وہ قابو نہ پا سکا تو اُس نے شیل کمل کو مخاطب کر کے پوچھا "آپ جانتی ہیں انھیں؟"

شیل کمل نے مسکرا کر، سہمی ہوئی خوشی کو دباتے ہوئے جواب دیا "ہاں، ہریش بابو!" پھر آنکھیں اُٹھا کر اپنے خاوند کی طرف اطمینان سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ہریش بابو! آپ کو یہ کیا سوجھی جو اِس طرح بھیس بنا کر ایسے وقت آئے؟ کیا ڈرانا چاہتے تھے؟"

ہریش کو مجبوراً پوری کہانی اُس وقت سے سُنانی پڑی جب سے وہ شیل کمل سے الگ ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پڑھنا

لکھنا چھوڑنے کے بعد کچھ دنوں تک تو وہ بہار کے زلزلے کے مارے ہوؤں کی مدد کرتا رہا۔ لیکن زیادہ دنوں تک بھوڈول کے دکھیوں کی خدمت نہ کر سکا کیونکہ جلد ہی اُس کی سماج سیوا سرکار کے نظروں میں کھٹکنے لگی۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہاں سے اُسے روانہ ہونا پڑا۔ لیکن، پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ بیمہ کا کام اِسی خیال سے شروع کیا۔ مگر جب سی۔ آئی۔ ڈی کو یہ شبہہ ہوا کہ وہ بیمہ کے اشتہاروں سے زیادہ ضروری چیزیں اپنے تھیلے میں لئے پھرتا ہے تو پولیس اُس کے پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ اِس طرح اب سال بھر سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ یہاں سے وہاں بھاگتا پھرتا ہے۔ کہیں ایک جگہ زیادہ دن تک نہیں ٹھہر سکتا۔ شہر میں اگر رہتا ہے تو صرف رات کو نکلتا ہے۔ لیکن عام طور سے وہ شہر سے دور رہتا ہے۔ ضروری کام پڑنے ہی پر شہر آتا ہے۔

شیل کمل سہمی ہوئی ہریش کی داستان سُنتی رہی۔ کمرہ میں سوائے ہریش کی دھیمی آواز کے مکمل خاموشی تھی۔ باہر جاڑے کی رات دنیا کو دبائے بیٹھی تھی۔ دُور کہیں سے کُتے کی بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ کُتے کا بھونکنا سُن کر وہ باربار باہر دیکھتی اور

پھر ہریش کے چہرے پر گہری جھرّیوں اور لکیروں کو دیکھتی ۔
ہریش پورے ماحول کا مالک بنا بیٹھا تھا، جس میں شیل کمل اور
اور نامہ نگار کھلونوں جیسے کھوئے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہریش
دونوں کی پریشانی کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا اور اُسے یہ بھی شبہہ ہوتا
کہ دونوں شاید اب بھی ڈر رہے ہیں۔ چنانچہ جیسے دونوں کی
نبضوں پر اُنگلیاں رکھتے ہوئے اُس نے کہا ” بھُوکا کُتّا، جاڑے
کی اندھیری رات میں، کہیں بھونک رہا ہے“ یہ کہہ کر وہ اُٹھ
کھڑا ہوا اور مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ پھیلایا
— ” پانچ روپیہ آپ اور پانچ روپیہ آپ “
شیل کمل اور اُس کے خاوند دونوں پریشانی کی حالت میں
اُسے دیکھتے رہے۔ شیل کمل اندر گئی اور ایک ہاتھ میں دس روپیہ
کا نوٹ اور دوسرے میں چابی کا گُچھا لئے باہر آئی ۔ اُس کے ہاتھ
سے نوٹ لیتے ہوئے ہریش نے مُسکرا کر کہا — ” غریبوں
کے لئے “

اُس رات کو شیل کمل کے اوپر جو بیتی وہ شیل کمل ہی جانتی ہے۔
اپنے خاوند کے ساتھ سوتے سوتے کانپ کر یکایک وہ چلّا اُٹھی۔ نامہ
نگار نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا ” کیا ہوا کمل ؟“

سہمی ہوئی، شیل کمل نے بچوں جیسی آواز سے بتایا: "شاید خواب دیکھ رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ایک کُتّا بھونک رہا تھا۔ باہر جا کر اندھیری رات میں کھو گیا۔"

کچھ دیر ڈری ہوئی خاموش بیٹھی سامنے دیوار پر تکتی رہی۔ پھر اُس نے ہلکے لہجہ سے کہا: "اُس کو میں سمجھی نہیں۔"

....

شہر سے وہ جگہ قریب ۲۷ میل کی دوری پر ہے۔ لگ بھگ ۲۰ میل تک تو پکّی سڑک ہی چلی جاتی ہے۔ اُس کے بعد پکّی سڑک چھوڑنا پڑتا ہے، کیونکہ پکّی سڑک دکھن کی طرف نکل جاتی ہے۔ جہاں سے پکّی سڑک چھوٹتی ہے وہیں سے جنگل کا حاشیہ شروع ہو جاتا ہے۔ اصل میں وہیں سے جنگل اور پہاڑ دونوں شروع ہوتے ہیں۔ اُسی پہاڑی جنگل میں سے ہو کر وہ لیک نکلی ہے، جس پر مشکل سے ایک بیل گاڑی نکل سکتی ہے۔ آدمیوں کے چلنے کے نشان البتّہ صاف نظر آتے ہیں۔ لیک دُور جنگل اور جھاڑی کے اندر جا کر ٹیڑھی میڑھی ہونے لگتی ہے۔ راستہ میں اکثر گڈھے ملتے ہیں۔ پتھر کی بڑی بڑی چٹانیں تو قدم قدم پر ہیں۔ پتھر کے ٹکڑوں کے درمیان کانٹے دار

جھاڑیاں اُگی ہیں۔ جھاڑیاں اتنی گنجان ہیں کہ اُن کے بیچ سے نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ صرف جانوروں کے پیروں کے نشان جھاڑیوں کے بیچ میں نظر آتے ہیں۔ جھاڑیوں، پتھروں اور گڈھوں کی وجہ سے راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا ہے، یعنی راستہ اتنا ٹیڑھا میڑھا ہے کہ اُس پر کھڑا ہو کر جھاڑیوں کی وجہ سے سامنے پچاس گز بھی آگے دیکھا نہیں جا سکتا۔ لیک رسّی کی طرح دائیں بائیں گھومتی اور چکّر کھاتی ہوئی آگے معلوم نہیں کہاں چلی جاتی ہے۔

اُس لیک سے سات ہی آٹھ میل آگے جا کر پتھّر چٹّا ملتا ہے۔ اِس دنیا میں سب کچھ پتّھر ہی پہاڑ ہے۔ لیکن خاص طور سے اِس جگہ کا نام پتھر چٹّا اِس وجہ سے ہے کہ یہاں کبھی پتھر کی کھدائی ہوتی تھی۔ یہیں سے لمبی لمبی اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑیوں کے نیچے سُرخ رنگ کا پتھر ملتا ہے جس کی کسی زمانہ میں یہاں کھدائی ہوا کرتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ کا نام پتھّر چٹّا پڑ گیا۔ لیک یہیں سے ایک پہاڑی پر چڑھ کر معلوم نہیں کس طرف چلی جاتی ہے۔ اور یہیں سے لیک چھوڑ کر داہنے طرف جانے کے لئے پگڈنڈی

پکڑنا پڑتا ہے۔

پتھر چیتا سے داہنے طرف چلتے وقت جنگل بہت گھنے ہو جاتے ہیں۔ آدمیوں کے آنے جانے کا کوئی راستہ یہاں نہیں ہے۔ صرف جنگلی جانوروں کے پیروں کے نشان یہاں وہاں نظر آتے ہیں۔ ہرن اور نیل گائے کی مینگنی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگلی جانوروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ جنگلی سوروں نے پودوں کی جڑوں میں تھوتھن سے گڈھے بنا دیئے ہیں۔ برسات میں جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو سور انھیں پودوں اور درختوں کی جڑیں کھود کر کھاتے ہیں۔

لگ بھگ آٹھ میل تک ایسے ہی گھنے جنگل ملتے ہیں۔ یہاں سے ہو کر گزرنا خطرے سے خالی نہیں۔ خاص طور سے گنجا ندی کے نزدیک پہونچ کر راستہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ تیندوے وہیں رہتے ہیں جہاں ہرنوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ لیکن گنجا ندی کے پاس، جہاں جنگل بہت گھنا ہو گیا ہے، دن کے وقت اکثر چیتے بھی نظر آجاتے ہیں۔ دریا کے کنارے جب چیتے پانی پینے آتے ہیں تو شکاری یوں کے

بھاگ کھل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں شکاریوں کا گزر کہاں۔ یہاں تو بغیر ہتھیار کے آدمی تو چیتوں کے شکار بن جاتے ہیں۔

دریا پہاڑی ہے اس لیے برسات کے علاوہ ہر موسم میں سوکھا رہتا ہے۔ دریا کی تہہ میں صرف پتھر ہیں جاڑے اور گرمی میں پتھریلی تہہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے پتھر پگھلا کر دریا کی تہہ میں بہا دیا ہے۔ پتھروں کے بیچ سے پانی کے پتلے پتلے سوتے جاڑے اور گرمی میں بھی تیزی سے بہتے رہتے ہیں۔ آدمی ان پتھروں پر پیر رکھ کر اس پار سے اُس پار چلے جاتے ہیں۔

دریا اس طرح پار کرتے وقت کبھی کبھی پانی ریلتا ہوا آجاتا ہے اور بھاگنے والے بھاگ بھی نہیں پاتے۔ پہاڑی ندی کے برساتی پانی کے ساتھ بہنے والوں کے سر پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ دریا کے بیچ انھیں پتھروں کے دراروں میں گھڑیال بیٹھے رہتے ہیں، جو دریا پار کرنے والوں پر دُم سے چوٹ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

جاڑوں میں دن کے وقت گھڑیال اور گونھٹے پانی سے

نکل کر پتھروں پر دھوپ کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔
دریا پار کرکے ایک میل جانے پر بانڈاراج کی سونی چھاؤنی ملتی ہے۔ چھاؤنی کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہاں وہ کس غرض سے بنی ہوگی، کیونکہ نہ تو کوئی چھاؤنی میں رہتا ہے اور نہ اُس کے دس پانچ میل آس پاس کوئی آبادی ہی ہے۔ بانڈاراج ایک زمانے سے "کورٹ" کے ماتحت ہے۔ اس لئے اب یہاں نہ کوئی آتا ہے اور نہ اُس کی مرمت کراتا ہے۔ آس پاس کے جنگل اور ساری زمین بانڈاراج ہی کی ہے۔ اس لئے چھاؤنی راجہ صاحب کا شاید قبضہ دکھانے کے لئے بنی ہو۔ راجہ بانڈا شکار کے لئے جب آتے رہے ہوں تو شاید اسی چھاؤنی میں ٹھہرتے بھی ہوں۔ چھاؤنی کے لئے ایک مہتو یعنی چوکیدار اب بھی مقرر ہے، جو چھاؤنی سے آٹھ میل کی دوری پر رہتا ہے، جہاں اُسے تیس ایکڑ زمین معافی ملی ہے۔ چھاؤنی میں تالا اُسی کا بند رہتا ہے، اور اُس تالے اور چھاؤنی کی نگرانی گاہے ماہے وہ اب بھی کر جاتا ہے۔

....

چھاؤنی میں ان دنوں ہریش رہتا تھا۔ ساتھی اُس کے کئی تھے جو آتے جاتے رہتے تھے۔ مستقل ساتھی اُس کے دو ہی تھے، ٹائپ رائٹر اور سائیکلو اسٹائل مشین۔ اس کے علاوہ بہت سے پُرانے اخباروں اور چھپے اور سادہ کاغذوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ لیکن جب سے ہریش بیمار پڑا اُس وقت سے ٹائپ رائٹر بھی بیمار تھا اور سائکلو اسٹائل مشین بھی۔ کاغذ اور کتابیں الگ بکھری پڑی تھیں۔ ہریش کی تیمارداری کے لئے پارٹی نے کامریڈ داگڈا کو بھیج دیا تھا۔

ہریش اپنے ساتھ ہومیوپیتھی دوائیوں کا ایک بکس بھی رکھتا تھا۔ معلوم نہیں کب کیسا اتفاق پڑے۔ پارٹی کی طرف سے تھوڑی ٹنچر، روئی اور مرہم وغیرہ بھی رکھنے کی تاکید تھی۔ چوٹ وغیرہ لگنے پر مرہم پٹی وہیں کی وہیں ہو سکتی تھی۔

اپنے ساتھ ہریش ایک ریوالور بھی رکھتا تھا جس کی اجازت پارٹی کی طرف سے نہیں تھی۔ لیکن جنگل اور پہاڑوں پر سے گذرتے وقت اُس کے ہونے سے ہریش ہی کی نہیں

بلکہ پارٹی کے دوسرے ممبروں کی بھی ہمت بندھتی تھی۔ بہار کے زلزلے کے زمانہ میں ریوالور ہریش کو اُس کے ایک پُرانے انقلابی دوست نے رکھنے کو دیا تھا، جسے کبھی لوٹانے کا موقع نہ آیا۔ لیکن اس کے علاوہ خود ہریش کو جو بات نہ معلوم تھی وہ یہ تھی کہ اچھا خاصا کامریڈ ہوتے ہوئے بھی وہ بیحد جذباتی تھا۔ چنانچہ جو پُرانی چیزیں اُس کے پاس پڑی رہ گئی تھیں اُنھیں چھوڑنا وہ گوارہ نہیں کرسکتا تھا۔ اسی طرح اُس کے منی بیگ میں ایک پُرانی کیرم کی گوٹ بھی پڑی تھی۔

دیر سے واگڈا باہر برآمدہ میں بیٹھی تھی۔ مکان کے بائیں طرف سے کسی کے آنے کی آہٹ ملی۔ اُسے چڑھ سی ہوئی۔ واگڈا نے سوچا کمبخت مہتو پھر آیا۔ لیکن جب چھاؤنی کے مہتو کے بجائے کامریڈ انور نظر آیا تو اُسے بہت تسکین ہوئی۔ انور برآمدہ میں چڑھتے وقت اپنے دونوں پیر زمین پر پٹکنے لگا تاکہ جوتے سے کیچڑ نکل جائے۔ مِس واگڈا نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے آواز پیدا کرنے سے روک دیا۔ انور نے آہستہ سے چھاتہ برآمدہ میں سوکھنے کو رکھا اور آکر واگڈا

کے بغل میں چپکے سے بنچ پر بیٹھ گیا۔

"اب کیا حالت ہے؟"

"وہی ہے۔ رات کو بخار کچھ کم ہوجاتا ہے اور وقت ویسا ہی رہتا ہے۔"

"نہیں، میرا مطلب، دماغی کیفیت کیسی ہے؟ اب بھی ویسے ہی بکتا جھکتا ہے یا۔۔۔"

"بالکل ویسا ہی ہے۔ کل تو گھنٹوں کیرم کیرم لگائے تھا۔ باہر سے کوئی سنتا تو سمجھتا کہ سچ مچ کوئی کیرم کھیل رہا ہے۔ میری سمجھ میں تو اس کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اب کی کیا دوا بدلی ہے؟"

"دوا تو دوسری بتائی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسا بخار ہے۔ مجھے تو ٹائیفائڈ کا شبہہ ہوتا ہے۔"

"ٹائیفائڈ اور اس موسم میں؟"

"کیوں اس میں کیا؟ ٹائیفائڈ تو اب ہر موسم میں سننے میں آنے لگا ہے۔ میرا خیال یہی ہے۔ لیکن وہ کچھ بتاتے نہیں، چاہے ہزار کوئی ان سے پوچھے۔"

"ہومیوپیتھی میں یہی تو سب سے بڑی دقت ہے۔ بس

اندھے کے ہاتھ کی خلیل لگ گئی تو واہ واہ نہیں تو چلو۔"

"ہاں۔"

"اِن کمبختوں کے وہاں تو بس علامت ہی علامت کی رٹ لگی رہتی ہے۔ یہ سمپٹم اور وہ سمپٹم، معلوم نہیں الا بلا کیا بکتے ہیں سب۔"

"ہاں، مگر تم خیال رکھنا کہ آخر کیا کیا بکتا ہے کیونکہ اس پر وہ بہت زور دے رہے ہیں۔"

"وہ دیتے رہیں۔ اُس میں بھی کوئی فرق ہے۔ بخار تیز نہیں ہوا کہ کیرم کی گوٹ، کمل اور نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ بکنے لگتا ہے۔"

ٹھہر کر، سامنے دیکھتے اور کچھ سوچتے ہوئے "بچے کو نہ جانے ہو کیا گیا ہے۔ میرا جی گھبراتا ہے۔ معلوم نہیں کیا ہو۔ لیکن کون ہے یہ شبل کمل۔"

"کامریڈ تم بھی کمال کرتی ہو۔ کہاں کہاں سے مارا آرہا ہوں۔ تم نے ایک پیالی چائے کو بھی نہ پوچھا اور — پہلے پارٹی کی خبریں تو سنو، کیا کمال کر رہے ہیں شہر میں یار لوگ۔"

ڈاکٹر اچھٹ اٹھ کر جانے لگی "معاف کرنا کامریڈ —

باتوں باتوں میں بھول ہی گئی تھی ۔ چاء گرم ہو گی ۔ میں ابھی پی کر آئی ہوں ۔ برتن آگ پر رکھا ہے ۔ آج دن بھر چاء ہی تو پیتی رہی۔ ایسی بدلی اور سردی کہ ۔۔۔"

" ٹھہرو! ہاں ، دیکھنا اُسے نہ جگانا اگر سو گیا ہو تو ۔ ورنہ پارٹی وغیرہ کی تمام بکواس کرنے لگے گا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے اوپر اس کا بھی بڑا اثر ہے ۔ ایسے نازک وقت پر وہ اِس طرح بیکار ہو گیا ۔ اگر کسی طرح اُس کے دماغ سے پارٹی اور کام کا خیال نکل جاتا ۔"

" یہ ہو جاتا تب کیا تھا ۔ چاء لے کر آئی ۔"

" سُننا ذرا ۔ مہتو تو نہیں آیا تھا ؟"

" آئی !" دور سے چیخ کر واگڈا مکان کے پیچھے غائب ہو گئی ۔ انور نے مکان کے سامنے کے دروازہ پر تالے کو بند دیکھا اور سوچنے لگا ۔ اپنے جان میں ہم لوگ ہر طرح احتیاط سے کام لے رہے ہیں ۔ لیکن یہ کمبخت مہتو پیچھے ہی پڑ گیا ہے ۔ معلوم نہیں اس کے سر کیا بھوت سوار ہے ۔ لالچ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ۔ ہر طرح سمجھایا کہ جب ہم لوگ کامیاب ہو جائیں گے تو چھاونی اور یہ ساری زمین تمھاری ہو جائے گی ۔ لیکن وہ تو روز ہی

کوئی نیا افسانہ رچ کر لاتا ہے۔ اسے کوئی بہکاتا تو نہیں ہے؟
یہاں ہم لوگوں کے ہونے کی کسی کو خبر بھی کیا ہوگی۔ لیکن یہ
روز کوئی نہ کوئی بہانا گڑھ کر ہم کو ڈراتا ہے۔ سمجھ میں نہیں
آتا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ کام ہی
توڑ کر رکھ دے گا۔

ہریش کی حالت ایسی ہے ورنہ کوئی اور انتظام کرنے کی سوچتے۔
لیکن اب اسے لے کر کہاں جائیں۔ پارٹی کا سارا کام ستیاناس
ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بمبئی والے سمجھتے نہیں کہ ہم لوگ
کس طرح یہاں کام چلا رہے ہیں۔ جب دیکھئے تقاضا لگا رہتا
ہے کہ جو ڈھیلا پڑتا ہے اسے کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن اس طرح
روز ہم کاٹتے جائیں تو رہی کتنے جائیں گے۔ اور جب ہمارے
سامنے مرنے جینے کا سوال ہے ہم کیسے اتنی سختی سے کام لے کر
اپنا کام کر سکتے ہیں۔ ہر طرح کے آدمی ہیں ہمارے ساتھ،
الگ الگ ان کے کام کرنیکے طریقے ہیں۔ سب کو ایک ہی
پیمانے سے تو ہم ناپ نہیں سکتے۔ اور پھر ہم کو کیا مطلب کہ
کس کے اندر کیا گذر رہا ہے۔ کسی کے ذاتی مسئلوں سے
ہم کب تک الجھتے رہیں۔ اور اس نظریہ سے کام لیں تو گاڑی

کیا آگے چل بھی سکتی ہے۔کام سے غرض، کسی کے ذاتی مرحلوں
سے غرض تو ہے نہیں۔ہم کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کون کتنا
کرسکتا ہے۔سب ایک سا تو کرسکتے بھی نہیں۔ہاں، پُوتُو کا طریقہ
ہرگز صحیح نہیں۔اِس میں شک نہیں۔یہ وقت نہیں ہے کہ
ہم اپنے ذاتی مسئلوں سے اِس طرح اُلجھے رہیں۔دشمن آج
اپنی ساری طاقت ہمارے ہی خلاف لگا رہا ہے اِس لئے
اگر ہم نے حد درجہ احتیاط اور جانبازی سے کام نہ لیا تو ایک ہی
چھاپے میں ہم ختم ہو سکتے ہیں۔پُوتُو کا وہ حال ہے۔نیمی کے
کام کرنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ہریش اِس طرح پڑا ہوا
ہے۔ہریش کا سوال۔

ہریش کا خیال آتے ہی ہریش کے واسطے انور کے
سارے نرم جذبات اُبھر آئے اور وہ اُس کے بارے میں اُس
وقت سے سوچنے لگا جب وہ ناظر صاحب کا کُل سات سال
کا اکلوتا لڑکا تھا۔گھر میں اکیلا ہونے کی وجہ سے اُس کا بچپنا
کچھ عجیب سنجیدگی کے ماحول میں گذرا۔ناظر صاحب اِس قسم کے
والد نہیں تھے جو کئی لڑکے کھو کر آخری لڑکے پر اپنی ساری محبت،
لاڈ اور پیار نچھاور کر دیتے تھے بلکہ دو بڑے لڑکوں کی جوان

موت دیکھ کر وہ اولاد کی طرف سے ایسے مایوس ہو گئے تھے کہ جیسے ہریش کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا اُن کے واسطے برابر تھا۔ مطلب اس کا یہ نہیں کہ وہ لڑکے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے یا اُن کی مایوسی نے کسی قسم کی سختی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اِس کے خلاف، ہریش کے ساتھ اُن کا کچھ ایسا سلوک تھا۔ جیسے پہلے لڑکے تھے ویسے ہی ہریش بھی ہے۔ اُس کے رہنے میں اُن کا اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا دوسرے بچّوں کے نہ رہنے میں رہا ہوگا۔ اس لئے اگر اُن لڑکوں کے نہ رہنے پر وہ مر نہ گئے تو آج ہریش کے رہنے پر جی کیسے اٹھتے۔

ایسے گھر میں ہریش کی زندگی اس طرح شروع ہوئی۔ بچپنا تنہائی میں گذرا۔ کوئی دوسرا بچّہ گھر میں تھا نہیں جس سے اُس کے بچپن کو نشو نما ملتی۔ پاس پڑوس میں وہ جا نہیں سکتا تھا اس لئے کہ ماں باپ کو وہ چیز زیادہ پسند نہ تھی۔ اس لئے اسکول سے آکر بقیہ وقت گھر ہی میں گزارتا۔ اُس کے لئے ماں اور باپ کی زندگی کے درمیان اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ ماں زیادہ وقت پُوجا پاٹ میں گذارتی تھیں۔ اُنھیں بڑے لڑکوں کے نہ ہونے کا اتنا ہی افسوس تھا جتنا ہریش کے ہونے پر تسکین

تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ بھگوان کی سیوا میں زیادہ رہتی تھیں۔
لیکن ناظر صاحب کو نہ افسوس تھا اور نہ تسکین۔ اس لئے اُن
کی نظر میں شاید بھگوان بھی اب ایک غیر ضروری چیز تھے۔
جہاں تک ہریش کا سوال تھا، ماں اور باپ دونوں کا برتاؤ
اُس کے ساتھ یکساں تھا کیوں کہ جہاں ناظر صاحب اپنی
طبیعت یا فطرت کی وجہ سے ہریش سے نہ بہت خوش اور نہ
مانوس ہو سکتے تھے وہاں اُن کی بیوی اس ڈر سے ہریش کو
سوچ کر یا دیکھ کر زیادہ خوش نہ ہوتی تھیں کہ وہ خوشی شاید
بھگوان کو پھر اچھی نہ لگے۔ چنانچہ ہریش اپنے گھر کی ایسی اولاد
تھا جس کے والدین اُس سے اِس وجہ سے خوش نہیں رہتے
کہ اُن کی خوشی شاید بھگوان کو اچھی نہ لگے اور وہ اُسے دنیا سے
اُٹھا لیں۔ ایسے بچّوں کو اکثر لاپرواہی سے رکھا جاتا ہے،
اُنھیں معمولی کپڑے پہنائے جاتے ہیں، ناک اور کان
چھِدوا کر اُنھیں بدشکل بنا دیا جاتا ہے اور اُن کے بے تُکے
نام رکھے جاتے ہیں۔ اِس بے توجہی کے پیچھے توجہ اس بات
پر رہتی ہے کہ اُس کی طرف خدا کے فرشتوں کی توجہ نہ ہو۔
خوشی کا اظہار اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ خوشی سے ناراض ہو کر

بھگوان اُس خوشی کو چھین نہ لیں۔

انور، جو ہریش کی ابتدائی زندگی سے بخوبی واقف تھا، ہریش کے بارے میں اس طرح غور کرتے کرتے اُس کو ایک سماجی مسئلہ بنا کر سوچنے لگا، اور پھر اِس سوالیہ نتیجہ پر پہنچا کہ جس بچے کے واسطے زمین اور آسمان کے درمیان اُمید و بیم کی ایسی بندش بندی ہوتی ہو اُس وقت اُس بیچارے بچے کے اوپر کیا بیتتی ہوگی۔ اور اس مسئلہ پر جب اُس نے نفسیاتی نظریہ سے سوچا تو اِس نتیجہ پر پہنچا کہ ہریش بچپن ہی سے بیمار تھا۔ بیماری سے اُس کا مطلب نفسی بیماری تھی۔

کامریڈ واگڈا ایک ہاتھ میں چائے کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں تشتری جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی، لئے آگئی جس وقت وہ ناشتہ کی چیزیں انور کے بغل میں بنچ پر رکھنے لگی تب بھی وہ خیالات کی بھول بھلیاں میں کھویا ہوا تھا اور اُس کے سوچنے کا سلسلہ اُس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ واگڈا نے کہا نہیں "دوپہر سے بکتا بکتا اب جاکے سویا ہے۔"

"ہریش بہت دنوں سے بیمار ہے۔ حالانکہ اُس نے کبھی اِسے مانا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُس بیماری سے اُسے کبھی نجات نہ ملی

شاید مل بھی نہیں سکتی تھی۔"

بے سر پیر کی بات سن کر واگڈا سے جب رہا نہ گیا تو اُس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "رہ رہ کر یہ کیا بکنے لگتے ہو تم؟ آخر کون کب سے بیمار رہے؟"

انور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اور گلاس سے چائے پیتے ہوئے اُس نے کہا۔ "نہیں میں نے یہ کہا کہ بچارہ ہرِیش ہمیشہ سے بیمار رہا ہے۔ تم نے پوچھا نہ تھا کہ کِل کِل وہ کیا بکتا ہے ---"

اتنا کہہ کر انور اپنے خیال کے اشارے سے ایک دم چونکا اور خود کو سنبھالنے کی غرض سے گرد سے بھری ہوئی بنچ پر بیٹھنے کے لئے جگہ دیکھنے لگا۔ اُس نے سوچا واگڈا کامریڈ ہی سہی، لیکن کسی عورت سے اس قسم کی باتیں کرنا کہاں تک مناسب ہو سکتا ہے۔ اگر کسی سے محبت یا کوئی ذہنی لگاؤ کسی کو ہو تو اُسے بیماری کہہ کر تو نہیں پکارا جا سکتا۔ اگر مرد عورت کی باہمی زندگی محض بیماری ہے، نفسی ہی سہی، تو انسانی صحت کے لئے زمین پر صرف مرد یا عورت ہی کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اِس اُلجھے ہوئے طریقہ سے سوچ کر انور نے چاہا کہ بات بدل دے۔ چنانچہ بنچ پر بیٹھ کر اُس نے دو گھونٹ جلتی ہوئی چاء پی اور تشتری میں سے

لیک اخروٹ اُٹھاتے ہوئے بولا ــــ" ہریش کے ماں باپ جب سے مرے تبھی سے اُس کی حالت بگڑنے لگی۔ یعنی ویسے تو وہ یہ معلوم نہیں ہونے دیتا کہ اُس نے اُس واقعہ سے زیادہ اثر بھی لیا۔ لیکن میں اُس سے چونکہ ایک زمانہ سے واقف ہوں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ اُس کے اوپر کیا بیتی۔ ماں کا انتقال تو جب وہ بنارس میں پڑھتا تھا تب ہی ہوا۔ لیکن جب گھر گیا تو باپ نے کہا کہ پڑھائی چھوڑ کر اب کوئی نوکری کر لو۔ بات اُسے زیادہ پسند نہ آئی۔ لیکن ہریش کی تو پوری زندگی ہی اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کام کرنے کی جیسے ایک زندہ مثال یا مکمل کہانی ہے۔ چنانچہ جب والد کے سامنے سوائے لفظ "ہاں" کے کچھ اور کہنا اُس نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا تو اُن کی بات مان لینے کے سوائے کیا کرتا۔ باپ کی پنشن کا وقت آگیا تھا اس لئے اُنھوں نے سوچا اپنے جیتے جی ہریش کو کہیں کا کر دوں۔ لیکن زمانہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے کہیں نوکری مل جاتی۔ گھر میں بیچارہ پڑا پڑا اوب جاتا۔ باپ کی صحبت کچھ ایسی تھی نہیں کہ اُن کے ساتھ بھی کسی کا جی لگتا ــــ"

واگڈا کو اِس کا شبہ تو نہ ہوا کہ انور نے بات بدل دی تھی۔

لیکن اُس کی بے ترتیب گفتگو سے اُسے یہ ضرور خیال ہوا کہ آج انور کچھ ایسی ذہنی کیفیت کا شکار ہو گیا ہے کہ بس بکتے ہی رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ شاید اُس کی بات ختم کرنے کی غرض سے واگڈرا نے پوچھا — "تو کیا تم اُسی زمانہ سے ہرلیش کو جانتے ہو؟"

انور چاء پی چکا تھا اِس لئے اُس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اب قمیص اور جانگھیے کی ساری جیبوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر دیا سلائی ڈھونڈھ رہا تھا۔ کسی طرح دیا سلائی ملی تو وہ ایسی سیل گئی تھی کہ جلانے سے نہ جلے۔ چنانچہ منھ میں سگریٹ دبائے اور ایک ہاتھ میں ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں سلائی کی بتی لئے اُس نے واگڈرا کے سوال کا جواب دیا —

"نہیں، اُس نے بتایا تھا مجھ کو۔ ملاقات تو اُس سے بہار کے زلزلے کے زمانہ میں ہوئی۔"

"لیکن تم نے بتایا کہ پڑھنا تو یہ چھوڑ چکا تھا؟"

"ہاں پڑھنا کچھ ہی دن پہلے چھوڑے تھا۔ میں بتا رہا تھا نا کہ جس زمانہ میں اُسے نوکری کہیں نہیں مل رہی تھی اور گھر پر بیٹھے بیٹھے اوب جاتا تو جی بہلانے کے لئے پڑوس میں کوئی اسٹیشن ماسٹر رہتے تھے، اُن کے وہاں شام سویرے چلا جاتا

تھا۔ماں جب زندہ تھیں تو وہ اسٹیشن ماسٹر کے وہاں آتی جاتی تھیں۔ اِس لئے اُن لوگوں کو ہریش بچپن ہی سے جانتا تھا۔"

"تو کمل اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی کیا؟"

"ہاں میں بتا تو رہا ہوں۔ اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی کا نام شیل کمل تھا۔ ہریش چھوٹے پنے سے اُس کو جانتا تھا۔ چونکہ ہریش کے وہاں سے صرف اسٹیشن ماسٹر ہی کے یہاں آنا جانا تھا اِس لئے ہریش اگر کبھی کہیں جاتا تو صرف اسٹیشن ماسٹر ہی کے وہاں"۔

"تو یہ کیرم دیرم جو بکتا ہے شاید اُس اسٹیشن ماسٹر ہی کے یہاں کھیلتا رہا ہوگا؟"

اُس وقت شاید یہ یہاں میں پڑھتا تھا لیکن چھٹی میں آتا تو اسٹیشن ماسٹر ہی کے وہاں جاکر جی بہلاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی چھٹی میں اسی طرح جب آیا ہوا تھا تو صبح شام اسٹیشن ماسٹر کے وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن دیر کر کے لوٹا تو اُس کی ماں نے اُس سے رات کو کھانا کھاتے وقت کہا۔ ہریش تمہارے بابوجی پوچھ رہے تھے۔ تمہارا کالج کب کھلے گا؟ بس ہریش کے لئے اِتنا کافی تھا۔ چنانچہ وہ

دوسرے دن بنارس کے لئے روانہ ہوگیا۔"
والڈا نے ہریش کے بارے میں اپنی تشخیص صحیح ثابت ہوتے دیکھ کر بات کاٹ دی "یہ تو میں نے بھی غور کیا ہے کہ باوجود اتنا پرانا اور منجھا ہوا کامریڈ ہونے کے ہریش نہایت ہی نازک مزاج انسان ہے۔ چاہے وہ کہے نا لیکن چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی اندر ہی اندر بہت اثر لیتا ہے۔"
"ہاں، دیکھو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ کتنی روشنی ڈالتا ہے اُس کی پوری طبیعت اور سیرت پر۔ اور سُنو، دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ اُس کے بعد اُس نے گھر ہی آنا چھوڑ دیا۔ یعنی چھٹیوں میں بھی کم ہی آتا تھا۔ اِس طرح اسٹیشن ماسٹر کا گھر اور شیل کمل سب اُس کے لئے ایک ساتھ ختم ہو گئے۔ اور اگر پھر کبھی اُن کے وہاں گیا تو کئی سال بعد، یعنی جس زمانہ میں بیکار گھر پر پڑا تھا۔ لیکن وہ بھی سلسلہ زیادہ دن نہ چلا۔ ایک دن یوں ہی پنشن یافتہ ناظر صاحب نے کہا۔ 'تم کو زیادہ کسی کے وہاں نہیں آنا جانا چاہیئے'۔ یہ اُس کیلئے کافی تھا۔ چنانچہ اُسی ہفتہ باپ سے بہانہ کر کے بنارس چلا گیا۔ اور وہاں سے یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ زلزلہ کے

بعد بہار گیا۔ لیکن اصلی زندگی اُس کی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کئی سال بعد شیل کمل کے گھر والوں سے ملاقات ہونے پر شیل کمل کے والد نے اُسے پہچانا بھی نہیں۔ شیل کمل سے کہاں سے ملتا۔ میری اُس کی ملاقات "۔

باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انور اور واگڈا دونوں خاموش ہو رہے لیکن جہاں زبانیں بند تھیں دماغ نہیں خاموش تھے۔ دونوں سوچتے رہے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک ہی بات سوچتے رہے ہوں۔ اگر ایک ہی بات نہیں سوچتے رہے تو کم سے کم دونوں کے خیالوں کی سُرخی شاید ایک ہی تھی۔۔۔ دونوں سوچتے رہے اور خاموش رہے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ واگڈا نے نگاہیں اُٹھا کر انور کی طرف دیکھا۔ جنگلی کہرا، جو چھاؤنی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا، اب برآمدہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ انور کا چہرہ واگڈا کو دکھائی نہ دیا۔ واگڈا نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اُس کے دماغ میں بھی کہرا پھیل گیا ہے۔ اُس نے ایک بار پھر کوشش کر کے انور کو دیکھنا چاہا۔ لیکن۔ ایسا محسوس کیا جیسے انور اُس سے کئی میل کی دوری پر بیٹھا ہے۔

"ہریش آج چھ سال سے پارٹی کے ساتھ ہے۔ پارٹی کے لوگ جانتے ہیں کہ اُس کے کندھے پر کتنا بڑا بوجھ ہے۔ لیکن اِس کے دل پر کتنا بڑا بوجھ ہے وہ شیل کمل بھی شاید نہیں جانتی۔ میں نے ہریش سے بار بار کہا کہ اگر ہو سکے تو اِس بوجھ کو دل پر سے اُتار دو۔ تمھارے واسطے یہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن ہریش نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا۔ اور ہمیشہ مجھے ہی سمجھایا کہ آج پارٹی کے کسی آدمی کو اِس قسم کی باتوں کو سوچنے کا بھی حق نہیں ہے۔ لیکن جہاں وہ مجھ کو اِس طرح سمجھا کر بہلا سکتا تھا، اپنے کو دھوکا دے کر بھی شیل کمل کے تصور سے نجات نہ پا سکا۔ ایک سو دو ڈگری بخار کی حالت میں میں نے ہریش کو پارٹی کے واسطے کام کرتے دیکھا ہے۔ آج میں ایسا سوچتا ہوں کہ اُس نے پارٹی ہی کو شیل کمل سمجھ لیا تھا۔"

مسز واگلڈا نے آنکھیں اُٹھا کر انور کی طرف پھر دیکھا۔ لیکن اب اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ بتا سکتی کہ انور وہیں یا وہاں سے کئی میل کی دوری پر سے بول رہا تھا۔ واگلڈا ایسا محسوس کر رہی تھی کہ جیسے کہرہ دماغ سے اُتر کر آنکھوں کی پتلیوں پر چھایا جا رہا ہے۔

"ہریش آج سے نہیں بلکہ ایک زمانہ سے بیمار ہے۔
اسے خود ہریش نے بھی نہیں سمجھا۔ آج اسے بیمار سوچ کر الیسا
محسوس کرتا ہوں کہ جیسے پارٹی بیمار ہے ...... میں بیمار ہوں
...... تم بیمار ہو ......"

" انور مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے
میں بھی ...."

انور نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔

" پارٹی کے سر پر خطرہ کی تلوار لٹک رہی ہے۔ ہریش کو
اچھا ہو جانا چاہئے۔ ورنہ ...... ورنہ ......"

" واگڈرا! واگڈرا !! کامریڈ واگڈرا، میں اچھا ہو گیا!!!"

" واگڈرا سُنتی ہو؟ ہریش بُلا رہا ہے"

" انور! انور تم کہاں ہو۔ سخت اندھیرا ہو گیا ہے، مجھے کچھ
دکھائی نہیں دیتا۔ میں بیمار ہوں ...."

آنسو اور پسینہ

کچھ دن ہوئے شاید کسی اخبار ہی میں میں نے خبر دیکھی
کہ ایک مہاوت ہاتھی پر سوار کہیں چلا جا رہا تھا۔ مئی جون
کا مہینہ تھا، اس لئے دیہات کی گرمی اپنے شباب پر تھی۔
چنانچہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے مہاوت نے سڑک
کے کنارے ایک باغ میں ٹھہر کر ایک پاسی کی دوکان
سے تاڑی خریدی اور پیاس کی شدت کم کرنے کی
کوشش میں شاید دو تین لوٹے پی گیا۔ پھر وہ ہاتھی پر
سوار ہوا اور، چونکہ شام ہوتے ہوتے شادی میں پہونچنا
تھا (اپنی نہیں، دور دیہات میں کسی زمیندار کے لڑکے
کی شادی میں) اس لئے ہاتھی کے سر میں ایک آدھ بار
انکوسی اور دونوں کانوں کے نیچے اپنے پیروں سے کے

انگوٹھے چبھا کر ہاتھی کی رفتار بڑھا دی۔ اونچے تاڑ پر سے شام کی اُتاری ہوئی تاڑی کو جب اونچے ہاتھی پر بیٹھے فیل بان کے پیٹ میں دوپہر کی دھوپ لگی تو تاڑی میں جیسے نیا ادبال پیدا ہوا جو شاید گھڑے میں کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آگے جا کر راستہ کے کنارے دو آم کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں فیل بان نے ہاتھی کو روک دیا اور اُس نے سوچا کہ زمین پر انگوچھا بچھا کر کچھ دیر آرام کر لے۔ مئی جون کی دوپہری کھلے ہوئے میدان میں تپتے ہوئے سورج کی گرمی لیئے ہوئے سنسنا رہی تھی۔ ہوا کسی طرف سے اپنا آہٹ بھی نہیں دیتی تھی۔ ہاتھی اُس گرمی میں درخت کے نیچے کھڑا رہا اور جھومتا رہا۔ لیکن پیٹھ پر بھاری ہودہ لئے کب تک ایک ہی جگہ کھڑا جھومتا رہتا۔ چنانچہ جب مہاوت نشہ کی گہری نیند میں سویا ہوا تھا ہاتھی اُس کے آس پاس گھومنے لگا۔ سونڈ سے اُس نے یہ سونگھا اور وہ سونگھا۔ لیکن نہ کچھ کھانے کو تھا نہ پینے کو اور گرمی وہی تھی۔ سونڈ اوپر کی طرف اُٹھا کر اُس نے آم کی پتیوں کا بھی اندازہ لگایا۔ لیکن آم کی اونچی پتیاں اُس کے لئے انگور نہ ہوتے

ہوئے بھی سمجھے رکھتی ہی رہیں۔ اِس لئے اب وہ اپنی سونڈ کے نوک سے ہاتھی بان کے سرہانے آہستہ آہستہ ٹٹولنے لگا۔ اکثر مہاوت لوگ پوٹلی سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی کیا ملتا۔ اِس لئے اب ہاتھی سونڈ سے مہاوت کی ناک سونگھ رہا تھا۔ ایک بار سونگھا، دو بار سونگھا۔ کچھ اچھا ہی لگا ہوگا۔ مہاوت کی بھیگی بھیگی سانس تاڑی سے شرابور تھی۔ اب جو ہاتھی کو شرارت سوجھی تو اُس نے سونڈ کی باریک نوک، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھی اُس کی مدد سے زمین پر سے سوئی اُٹھا سکتا ہے، سے مہاوت کے داہنے کان میں ٹٹولا۔ نشہ سے چور مہاوت چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ ہاتھی بالکل سرہانے کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ نہ سکا۔ ہاتھی کا بایاں پیر اپنے سر کے پاس دیکھ کر اُسے غصّہ کا ایک جھونکا سا آیا۔ اُس کے دُھندھلے دماغ سے ایک دُھندلی سی تصویر گزر گئی جس میں مہاوت کے سر پر ہاتھی کا پیر تھا۔ کچھ صاف تو وہ سوچ نہ سکتا تھا، تاڑی شاید سوچنے نہیں دیتی تھی۔ پھر جیسے نشہ کا ایک لہرا

آیا اور فیل بان نے ہاتھی کی طرف دیکھ کر جیسے غصّہ اور محبّت کے ملے جُلے بھاؤ سے کہا "کیوں بیٹا، ایسی بات!"

فیل بان نے محسوس کیا کہ جیسے ایک لمحہ کے لئے ہاتھی مُسکرایا۔ چنانچہ جب ہاتھی نے اپنا داہنا قدم آگے کی طرف اُٹھایا تو ہاتھی بان اُٹھ کھڑا ہوا اور اُچھل کر وہ دس قدم دُور گیا اور پھر اُس نے داہنی جانگھ پر تال ٹھونک کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "اچّھا تو آجاؤ جوان آج، پھر دیکھا جائی" یہ کہہ کر وہ آگے لپکا اور ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر اُس سے اپنی پوری طاقت لگا کر لڑنے لگا۔ ہاتھی کی سمجھ میں بھی وہ پہلوانی کا تماشہ کیا ہی آیا ہوگا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ تھوڑی دیر زور آزما کر اُس کا مہاوت بار بار پیچھے جاتا ہے اور پھر زور سے تال ٹھونک کر آگے اُچھل کر ہاتھی کی سونڈ سے کھمبے کی طرح لڑتا اور زور آزماتا ہے اور ساتھ ساتھ للکار للکار کر آوازیں بھی دیتا ہے تو ہاتھی نے سمجھا کہ فیل بان شاید کھیل کر رہا ہے۔ ہاتھی نے فیل بان کو سونڈ میں لپیٹ کر اُسے ہلکے سے زمین پر دے دیا۔ اور جب اُسی وقت اُس کے

سر میں بھی کھیل کی گرمی پیدا ہوئی تو اُس کا داہنا سر فیل بان کے سر پر گیا۔

اِس خبر کو اخبار میں پڑھ کر جب مہاوت کو میں نے تال ٹھونک کر ہاتھی کو چنوتی دیتے ہوئے سوچا تو جیسے پسینہ آ گیا لیکن جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ نامہ نگار نے یہ خبر اخبار میں دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ مہاوت نے تقریباً ایک گھڑا تاڑی پی لیا تھا اور ہاتھی کو بھی تاڑی پلا دیا تھا تو آدمی کی مورکھتا کو سوچ کر آنکھ میں آنسو آجاتا ہے۔

جس آدمی کو یہ سوچنے کی جیسے عادت پڑ گئی ہے کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں، وہ یہ آسانی سے نہیں سوچ سکتا کہ ہاتھی کو چنوتی دینے کے لئے آدمی کو ایک گھڑا تاڑی پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور پیٹھ پر پانچ من کا ہودہ بندھے ہوئے ہاتھی کو دس میل دھوپ میں چل کر داہنا پیر فیل بان کے سر پر رکھنے کے لئے تاڑی کے نشہ کی ضرورت نہیں۔

آدمی اُس زندگی کو کیا کہے جس میں خوشی اور غم ویسے ہی ہوں جیسے شطرنج کی بساط پر سفید اور سیاہ خانے۔ انسانی حوصلوں کے لئے ہمیشہ تاڑی یا شراب کے نشہ کی شاید

ضرورت نہیں ہوتی ۔ بقول شخصے، زندگی میں کسی نشہ کا سہارا لینا خود شکست کا اعلان ہے ۔ حوصلوں کے کھنڈروں ہی پر عموماً شراب اور تاڑی کے چراغ جلتے ہیں ۔ اقبال کا شعر ہے ؎

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

آدمی کے جب سارے حوصلے ختم ہو جاتے ہیں تب ہی شاید وہ فیل بان ہوتا ہے ۔ ورنہ زندگی کامیاب بنانے کے لئے ہاتھی رکھنا ہی کیا کم تھا ۔ نشہ کی حالت میں جو حوصلہ پیدا ہوا وہ ہاتھی کو شکست دینا کبھی بھی نہ تھا ۔ لیکن ہاتھی کمبخت اسے کب سمجھتا ہے ۔ اس لئے ہاتھی بان مر کے بھی یہی کہتا ہے ؎

گھر ہیں کیا تھا کہ تیرا غم جسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اِک حسرتِ تعمیر سو ہے

جب تقدیر بننے کو ہوتی ہے تو جو بھی آتا ہے وہ کچھ نہ کچھ دے کر جاتا ہے اور جب وہ بگڑتی رہتی ہے تو جو آتا ہے وہ کچھ لے کر ہی جاتا ہے ۔ آدمی اور دوسرے جانداروں میں ایک ہی فرق مانا گیا ہے عقل کا ۔ لیکن عقل کو خود ہم حوصلہ کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں ۔ اس لئے آدمی اور دوسرے جانداروں میں اصل فرق حوصلہ ہی کا ہے ۔ چنانچہ آدمی

کے حوصلہ نے جو چراغ جلایا اُسی کی روشنی کو انسانی تہذیب کہتے ہیں لیکن روشنی کے حاشیوں پر تاریکی ہے۔ چاہے آدمی اُس روشنی سے خوش ہو اور اِس تاریکی سے مایوس ہو، یا پہلے کو تاریکی اور دوسرے کو روشنی سمجھے۔ انسانیت کے لئے نتیجے بدلتے نہیں۔ مہاوت مر گیا، ہاتھی زندہ ہے۔ جب روشنی بجھ جاتی ہے تو تاریکی پھیلتی ہے۔ کسی کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے کسی کو بغیر نشہ کے حوصلہ سے نشہ کا حوصلہ تو فیل بان کا تھا۔ اُس سے کون ڈرے گا۔ مہاوت آنسو اور پسینہ کا مضمون ہے۔ آنسو غم اور خوشی دونوں کے ہوتے ہیں۔ پسینہ کامیابی کی کوشش کے لمحہ میں آتا ہے۔ لیکن شکست کی شرم کا پسینہ اور ہی ہوتا ہے۔ فیل بان ہمارا آنسو بھی تھا اور پسینہ بھی۔